نقار خانہ
(افسانے)
نوشابہ خاتون
ثالث پبلیکیشنز، مونگیر

نقار خانہ

(افسانے)

نوشابہ خاتون

ثالث پبلیکیشنز مونگیر

ابّا

سید محمد صالح (مرحوم)

کے نام

جن کی شفقتوں کو میں کبھی بھلا نہیں سکتی

فہرست

NAQQAR KHANA
(SHORT-STORIES)
Authored and Published
by
NAUSHABA KHATOON

نام کتاب : نقارخانہ
مصنفہ و ناشرہ : نوشابہ خاتون
پتہ : ۴۰۶ /رلوچن انکلیو، کنکڑباغ، پٹنہ ۸۰۰۰۲۰
سنہ اشاعت : 2006
تعداد اشاعت : چار سو
قیمت : Rs.150=00
اہتمام : اقبال حسن آزاد
پروف ریڈنگ : قیصر اقبال، محمد ارمان حسین
کمپیوٹر کمپوزنگ : ثالث کمپیوٹرس، شاہ کالونی، شاہ زبیر روڈ، مونگیر۔ ۸۱۱۲۰۱
طباعت : شوبی آفسیٹ پریس، نئی دلی

☆

ملنے کے پتے

☆ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۳۱۰۸ گلی وکیل، کوچہ پنڈت، لال کنواں، دہلی۔ ۱۱۰۰۰۶
☆ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ اردو بازار، جامع مسجد، دہلی۔ ۱۱۰۰۰۶
☆ بک امپوریم سبزی باغ، پٹنہ۔ ۸۰۰۰۰۴
☆ انجمن ترقی اردو، اردو گھر، راؤز ایوینو، نئی دہلی۔
☆ موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۹ گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی۔
☆ سیمانت پرکاشن، ۹۲۲ کوچہ روحیلہ، تراہا بہرام، دریا گنج، نئی دہلی۔

☆☆☆

استقبال

محترمہ نوشابہ خاتون غالباً بہت پہلے سے لکھتی آ رہی ہیں جیسا کہ ان کی زبان کی پختگی اور بیان کی سادگی و پرکاری سے ظاہر ہے، لیکن جہاں تک چھپنے کا تعلق ہے، ان کی مدت کار مختصر معلوم ہوتی ہے۔ حالیہ دو تین برسوں میں ان کے چند افسانے موقر رسائل و جرائد مثلاً شاعر، آجکل، ایوان اردو، روح ادب، مباحثہ، مژگاں، سبق اردو اور فنون وغیرہ میں متواتر شائع ہوئے ہیں۔ اور بعض میری نظروں سے بھی گزرے ہیں۔

''نقار خانہ'' نوشابہ خاتون کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے جو عنقریب شائع ہونے والا ہے اور اس کا کمپوز کیا ہوا مسودہ میرے پیش نظر ہے۔ اسے باضابطہ طور پر ترتیب دیا جانا باقی ہے۔ ویسے پیش نظر مسودہ میں ''سائبان'' سرفہرست ہے۔ اس کی ابتدائی عبارت ہی اپنے معنوی اور صوری حسن و کشش کی وجہ سے ہمارے ذوق مطالعہ پر مثبت اثر مرتب کرتی ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ کوئی بھی باذوق قاری اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا:

''کہیں دور سے آتی ہوئی شہنائی کی آواز نے آج پھر اس کے خوابیدہ جذبات میں ہلچل مچادی تھی، جسے ان دس برسوں میں اس نے بڑی مشکلوں سے تھپک تھپک کرسلایا تھا۔ اس نے پلٹ کر اپنے بغل والے بستر کی جانب دیکھا جو خالی پڑا تھا۔ دل میں درد کی ایک خفیف سی لہر اٹھی جسے دبا کر اس نے سوچا، کیا فرق پڑتا ہے؟ تو پھر یہ طلب، یہ تڑپ، یہ خلش، یہ اضطراب کیوں؟ کچھ پانے کی آرزو کیوں، کچھ کھونے کا دکھ کیوں؟
اس کے سارے خواب تو ردّی کاغذ کے ٹکڑوں کی طرح بکھر چکے تھے۔''

پہلا جملہ قدرے طویل ہے لیکن بیان کی نزاکتوں اور لطافتوں سے مملو ہے۔ جذبات کی تجسیم اور جذباتی کیفیت کی تشکیل جس فنکارانہ انداز میں کی گئی ہے اور معصومیت کا پیکر جس انداز میں تراشا گیا ہے، وہ یقیناً نوشابہ کے اسلوب نگارش کا امتیاز واختصاص ظاہر کرتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ 'جذبات' کا لفظ ان کیفیات کا حامل ہے جو کسی معصوم بچے سے مختص ہوتی ہیں۔ یہ کیفیات تھپک تھپک کر سلانے کے عمل سے ظاہر ہوتی ہیں۔ بڑی مشکلوں سے تھپک تھپک کر سلانے کے عمل نے ان کیفیات کی آبیاری کی ہے۔ اگر کوئی معصوم سا بچہ کسی ہلچل یا کسی غیر معمولی واقعے کی وجہ سے جاگ جائے اور بستر پر خود کو تنہا پائے تو اس کی کیفیت کیا ہوگی؟ تنہائی کے کرب کو لذت آگیں کیف سے مملو کر کے 'جہیز' کے عام مسئلے کو نوشابہ خاتون نے جس انداز واسلوب میں ڈھالا ہے، وہ افسانویت سے فطری مناسبت رکھتا ہے۔ موجودہ معاشرتی تناظر میں کسی لڑکی کے معصوم خواب اور شادی کے پیچیدہ مسائل سے کوئی ناواقف نہیں ہوسکتا اور وہ لڑکی جو مہذب اور متمدن خاندان سے تعلق رکھتی ہو لیکن اگر افلاس کی ماری ہو تو اس کا حشر کیا ہوگا؟ یہ ایک ایسی ہی لڑکی کی کہانی ہے۔

نوشابہ خاتون کے خاندان کے افراد اور عزیز واقارب مشرق ومغرب بالخصوص

خلیجی اور یورپی و امریکی ممالک میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ان میں سے اکثر تیوہاروں اور دوسری تقریبات کے مواقع سے ہندوستان آتے رہتے ہیں۔ خود نوشابہ خاتون بھی موقع بہ موقع بیرون ممالک کی سیر سپاٹے کیا کرتی ہیں اس لیے ان کے تجربات و مشاہدات میں رنگارنگی اور تنوع بھی پیدا ہو جاتا ہے اور اس بنا پر انھیں کہانیاں بننے کے لیے تمام ضروری مواد اور لوازمات مل جاتے ہیں۔ فرصت کے اوقات میں وہ سوئٹر، شال، میز پوش اور خوان پوش بننے کی بجائے افسانے بنتی ہیں اور تجربات و مشاہدات کے رنگارنگ دھاگے سے افسانے کی ایسی ایسی قبا کاڑھتی ہیں جن میں عمومیت کے ساتھ ساتھ خصوصیت کو نمایاں کرنے والے سلمٰی اور ستارے بھی ٹنک جاتے ہیں، اور اس طرح ان کی تخلیق کا ایک منفرد رنگ و آہنگ ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ ہر خواب، خیال انگیز تصویروں کا آئینہ خانہ بن جاتا ہے اور ہر حقیقت تعبیر نو بہار کا افسانہ بن جاتی ہے۔ احساس جمال فنکارانہ حسن کے ساتھ نمو پذیر ہوتا ہے جو لذت تاثیر سے مرحلۂ شوق کو مہمیز کرتا چلا جاتا ہے۔ نوشابہ خاتون کے چند افسانے مثلاً پکھیرو، علی میاں کی بلی، نقار خانہ، لکیر کے فقیر وغیرہ بھی پڑھ لیے جائیں تو ان کے شعور کی بالیدگی اور فن کی پختگی کا احساس ہو جائے گا۔ اظہار و بیان پر قدرت، زبان کی لطافت و نزاکت اور عمومی موضوعات و مسائل کے برتاؤ کی کیفیت اور بعض دوسری خصوصیات سے ان کے فن اور اقدار فن کا اندازہ لگانا مشکل نہ ہوگا۔ اس سلسلے میں نوشابہ خاتون کی نظر اور زاویۂ نظر کی بھی داد دینی ہوگی۔

فن اور فنکار کے رشتے کی وضاحت اسی بات سے ہو جاتی ہے کہ ساز کی رگوں میں صاحب ساز کا لہو دوڑتا ہے اور فن کے پیکر میں فن کار کی فکری بصیرت اسی طرح روشن ہوتی ہے جس طرح فانوس میں شمع اور فانوس سے چھننے والی روشنی کتنے اور کیسے کیسے عکس و نقش مرتب کرتی ہے، وہ ارباب نظر سے پوشیدہ نہیں۔ نوشابہ خاتون کے

افسانوں میں فکری عناصر کی ایسی ہی کیفیت محسوس کی جاسکتی ہے۔احساس کی لطافت اور بیان کی نزاکت نے فکر کی لذت کو دو آتشہ کر دیا ہے۔فنکاری کے کمال کی روشیں یہیں سے ہموار بھی ہوتی ہیں۔اس اجمال کی تفصیل سے گریز کرتے ہوئے ایک مجمل سی بات پھر اس طرح بیان کی جاسکتی ہے کہ نوشابہ خاتون کی آواز غالباً ان کے خیال میں طوطی کی آواز کے مصداق ہے اور وہ معاشرہ' وہ سماج یا وہ دنیا جس میں وہ جیتی ہیں ایک نقار خانہ ہے جس میں طوطی کی آواز کسی کو سنائی نہیں دیتی۔یہ آواز دل کی زبان سے ابھرتی ہو یا آنکھ کی نوک پلک سے یا فکر کے گنبد بے در سے' کسی بھی سمت سے یا کسی بھی رفتار سے' روایتی اقداری نظام کا زائیدہ اور پروردہ اس صورت حال میں جس ردعمل پر مجبور ہوگا' وہ غیر فطری نہیں اور یہی فطری تجربہ ہے جو نوشابہ خاتون کے افسانوں میں ڈھل کر فنی تجربہ بن گیا ہے جس میں ہر خاص و عام کو متاثر کرنے کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ ''نقار خانہ'' میں اس طوطیٔ فن کی آواز دور تک اور دیر تک سنی جائے گی اور اس کے خوشنما اثرات فردوس گوش بھی بنیں گے۔اسی یقین کے ساتھ میں اس مجموعے کا استقبال کرتا ہوں۔

☆☆☆

ڈاکٹر منظر اعجاز

۶/نومبر ۲۰۰۶

صدر' پوسٹ گریجوئیٹ شعبۂ اردو'

اے۔این۔کالج' پٹنہ ۸۰۰۰۱۳

اعتراف

افسانہ نگاری یا کسی بھی دوسرے تخلیقی عمل کے لیے آورد سے زیادہ آمد کی کیفیت معاون اور مددگار ثابت ہوتی ہے۔ اور اس کے لیے کسی معتبر یا طے شدہ سند یا کسی مخصوص ادارے کے تحت حاصل کی گئی ٹریننگ کی ضرورت حتمی اور لازمی نہیں ہوتی بلکہ یہ قدرت کی جانب سے ایک ودیعت یا عطا کے طور کسی صاحب قلم کے حصے میں آتی ہے اور پھر اس کا قلم فکر وفن کے نت نئے جلوے دکھا دکھا کر اصحابِ ذوق اور قارئین پر شوق کو اپنی فسوں سازی کا دیوانہ بنالیتا ہے۔ پریم چند اپنی افسانہ نویسی کے ابتدائی دنوں میں صرف میٹرک پاس تھے مگر ان کے فن کا سکہ جادو جگا چکا تھا۔ گو بہت بعد کو انھوں نے بی۔ اے کی سند بھی حاصل کر لی تھی لیکن اس سے ان کے معیار فن پر کوئی خاص اثر مرتب نہیں ہوا۔ اسی طرح سعادت حسن منٹو، سہیل عظیم آبادی یا شین۔ مظفر پوری اردو افسانہ نگاری کی دنیا میں ایسے معتبر اور عہد ساز نام ثابت ہوئے جن کے پاس بھی کوئی بڑی تعلیمی سند یا کوئی معروف علمی نسبت نہیں تھی مگر ان حضرات نے

افسانوی ادب کو نہ صرف منفرد نہج عطا کی بلکہ معیار اور وقار کا ایک بلند مرتبہ بھی بخشا اور اس کے بعد اردو افسانہ دنیا کی دوسری مقبول اور رائج زبانوں کی - Short Stories کے مد مقابل آ گیا۔ اردو افسانوں کے تخلیقی عمل کا سفر اسی طرح چلتا رہا اور اس عمل میں بہتیرے ایسے مرد اور خواتین قلم کاروں کی کاوشیں بھی شامل ہوتی رہیں جو بہت ہی معمولی اور غیر معروف سطح سے اوپر اُٹھ کر آئے اور افسانے کو وقت کی متقاضی قدروں کے ساتھ تخلیق کیا۔ تخلیق کاروں کی اسی کھیپ میں نوشابہ خاتون کا ایک نام بھی شامل کیا جا سکتا ہے۔

آج کے معتبر ادبی رسائل کے وسیلے سے نوشابہ خاتون اردو کے افسانوی ادب میں اپنی شناخت بنا چکی ہیں ۔ ان کی بیشتر کہانیاں ہمارے ہمہ جہت مسائل اور نوبنوع انسانی نفسیات و مشاہدات کا احاطہ کرتی ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ ایک خاتون افسانہ نگار ہونے کے ناطے صرف خواتین کی زندگی میں پیش آنے والے مثبت اور منفی واقعات یا ان کے استحصال کے روایتی قصے نوشابہ خاتون کے افسانوں میں جگہ پاتے ہیں بلکہ گھر آنگن کی کہانیوں سے آگے نکل کر وطنی اور عالمی پیش رفت کے نتیجے میں پیدا شدہ حالات بھی اکثر ان کے افسانوں کا موضوع بنتے ہیں جو یہ بتاتے ہیں کہ نوشابہ خاتون کی چوکس اور بیدار نگاہیں آج کی سیاسی' سماجی' معاشی اور اخلاقی قدروں کو بہتر طور پر پہچانتی ہیں۔ ''پکھیرو'' ''نقار خانہ'' اور ''آخری کہانی'' کے علاوہ اور بھی دیگر افسانے مثلاً ''جائے پناہ کہیں نہیں'' ''تلاش'' ''منو'' اور ''وطن میں اجنبی'' وغیرہ اس سچائی کی وضاحت کے لیے عمدہ مثالیں ہیں۔

نوشابہ خاتون ہمعصر افتاں وخیزاں زندگی جینے والے افراد کی داخلی اور خارجی کیفیات سے بھی اچھی طرح واقف نظر آتی ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں کے بیشتر کردار بالکل مانوس اور جانے پہچانے سے لگتے ہیں اور قارئین کی توجہ اور دلچسپی کا باعث

بھی بنتے ہیں۔ ''کوئی ویرانی سی ویرانی ہے'' ''خوشبو'' ''پشیمان'' ''بیڑیاں'' ''ہاتھی کے دانت'' اور ''احساس کا کربؔ'' کے کردار اس کے ثبوت کے طور پر پیش کیے جا سکتے ہیں۔

ایسا لگتا ہے کہ نوشابہ خاتون بہت قبل معیاری افسانہ لکھنے کے فن پر قابو پا چکی تھیں مگر کسی بنا پر لکھنے کا عمل کافی دیر سے شروع کیا اور جب شروع کیا تو پھر اپنے افسانوں میں کسی بھی مقام پر خام مواد یا کچا پن رہ جانے کی گنجائش نہیں چھوڑی۔ افسانے کی بنت اور زبان کی پختگی یہ بتاتی ہے کہ موصوفہ نے کثیر مطالعہ اور طویل مشق کے بعد ہی پورے بھروسے اور اعتماد کے ساتھ قلم اٹھایا اور اپنی ابتدائی کوششوں میں ہی معیاری رسائل کے صفحات کی زینت بن گئیں۔ پھر اسلوب نگارش بھی اتنا دلکش اور عمدہ کہ انہیں بہت جلد پختہ کار اور با اعتماد قلم کاروں کی صف میں شریک مان لیا گیا۔ یہ قول قدیم کہ: ''دیر آید درست آید'' نوشابہ خاتون کی کامل افسانہ نویسی پر صادق آتا ہے اور یہ اس دعویٰ کا جواز بھی بنتا ہے کہ ان کے افسانے پوری دلچسپی سے پڑھے جائیں گے۔

☆☆☆

قیصر اقبال
شاہ کالونی
شاہ زبیر روڈ
مونگیر ۸۱۱۲۰۱
۵/دسمبر ۲۰۰۶ء

اپنی بات

میں اپنا تعارف کیا دوں۔ بس یوں سمجھ لیجیے کہ میرے افسانے ہی میر اتعارف ہیں کیونکہ میرے پاس نہ تو کوئی بڑی ڈگری ہے اور نہ ہی میں ادبی ماحول کی پروردہ ہوں۔ البتہ درس و تدریس کا سلسہ ہمارے خاندان میں بہت پہلے سے یعنی ہمارے آباواجداد کے وقت سے ہی رہا ہے۔ نالندہ ضلع کے مضافات میں میرا آبائی گاؤں ہے لیکن میری پرورش وہاں نہیں ہوسکی۔ میرے والد دو بھائی تھے۔ چھوٹے بزنس مین اور والد ایک سرکاری ملازم تھے۔ ہر تین چار سال بعد ان کا تبادلہ ہوتا رہتا تھا اور ہم لوگ خانہ بدوش کی طرح ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے رہتے تھے۔ اسی بھاگ دوڑ میں میں وقفے وقفے سے اپنے گاؤں بھی جاتی رہتی۔ پڑھنے لکھنے کا منظم سلسلہ کوئی خاص نہ تھا۔ گرچہ تعلیم نسواں کا دور شروع ہو چکا تھا لیکن ابھی ہمارا خاندان اتنا ترقی یافتہ نہیں ہوا تھا کہ لڑکیوں کو اسکول اور کالج بھیجنے کی جسارت کی جاتی۔ مگر وقت کے بدلتے تقاضوں کے تحت بہت بعد میں کسی طرح آئی۔ اے کرسکی۔ جیسا کہ میں کہہ چکی ہوں کہ

درس وتدریس کا سلسلہ ہمارے خاندان میں بہت پہلے سے آرہا ہے۔تو شاید اسی کے نتیجے میں یہ جراثیم میرے اندر بھی موجود تھے۔ جب شعور کی طرف میرے قدم بڑھے تو میرے اندر مطالعہ کا سنجیدہ شوق پیدا ہوا۔

گاؤں میں میری ایک خالہ زاد چچی تھیں ۔ وہ بہت ہی نفیس مہذب اور اپنے وقت کی تعلیم یافتہ خاتون تھیں ۔میرے ساتھ بڑی شفقت سے پیش آتیں اور مجھے پڑھنے لکھنے کی تاکید کرتیں ۔ان کے گھر میں ایک پوری الماری کتابوں سے بھری تھی۔ میں ان میں سے قصے کہانیوں کی کتابیں چن چن کر بڑی دلچسپی سے پڑھتی۔

پھر ایسا ہوا کہ ہمارے چھوٹے ابا کچھ دنوں کے لیے ہمارے یہاں آگئے۔ چونکہ درس وتدریس کا مادہ ہمارے خون میں رچا بسا ہوا تھا لہٰذا میرا شوق دیکھ کر مجھے انھوں نے خود سے پڑھانا شروع کر دیا۔ان کے سمجھانے کا انداز اتنا موثر ہوتا کہ بات آسانی سے ذہن نشیں ہو جاتی ۔ان کے اس فن درلیس سے میں نے بہت فائدہ اٹھایا۔ میرے اندر اس شوق نے اتنا زور پکڑا' خاص کر کہانیوں کی طرف میری توجہ اتنی زیادہ ہوئی کہ جھٹ میں نے دو چار کہانیاں لکھ ڈالیں ۔اس وقت میری عمر صرف گیارہ بارہ سال کی رہی ہوگی۔

لیکن اس وقت میری کوششوں کی پذیرائی نہ ہوئی اور میری کہانیاں ردی کی ٹوکری میں پہنچ گئیں ۔اس کے بعد شغل دنیا اور گردش دوراں نے مجھے مہلت نہ دی لیکن میرا یہ شوق ادب میرے اندر کہیں دبا کچلا سا پروان چڑھتا رہا اور بار بار باہر آنے کے لیے بے چین رہا۔

پڑھے لکھے اور ادب کا ذوق رکھنے والے لوگ مجھے ہمیشہ متاثر کرتے ہیں۔ مجھے جب بھی موقع ملتا ہے میں ان سے کچھ سیکھنے کی کوشش کرتی ہوں۔ایسی ہی ایک محترم شخصیت نے مجھے کافی متاثر کیا اور ان سے میری خوب نبھنے لگی اور ان سے مجھے بہت کچھ

سیکھنے کا موقع ملا۔ ان کے پاس کتابوں کا انبار تھا۔ میں خوب پڑھتی اور لطف اندوز ہوتی۔ ایک بار میں نے انہیں خبر بھیجی کہ دل گھبرا رہا ہے کچھ پڑھنے کے لیے بھجوایئے۔ انھوں نے بچوں کا مقبول عام رسالہ ''کھلونا'' بھجوادیا اور اس پر لکھ دیا کہ:

''دل کے بہلانے کو پیاری یہ کھلونا اچھا ہے''

میں نے ان کے اس برجستہ مصرعہ سے بہت محظوظ ہوئی۔

اپنے اس شوق کی وجہ سے مجھے زبان و بیان پر تھوڑی بہت پکڑ بھی حاصل ہوتی رہی۔ اور اکثر کچھ لکھنے کے لیے اکساہٹ سی محسوس ہوتی۔ لیکن قلم اٹھانے کی ہمت نہ ہوتی کیونکہ میں خود کو اس کا اہل نہ سمجھتی تھی۔

لیکن پھر ایسا ہوا کہ میں نے اپنی ایک بزرگ خاتون کی سوانح عمری پڑھی جو ان کی خود نوشت ہے۔ اسے پڑھ کر مجھے حوصلہ ملا، تحریک ملی اور بالآخر میں نے قلم اٹھا ہی لیا۔ اوّل اوّل میں نے بھی پہلے اپنی زندگی میں رونما ہونے والے چند تلخ و شیریں واقعات قلم بند کیے، پھر دھیرے دھیرے اور بھی کچھ لکھنا شروع کیا۔ اس بار میری تخلیق ردی کی ٹوکری میں تو نہیں پہنچی لیکن فائلوں میں بند ہوتی رہی۔ مگر پھر وقت آنے پر موقر ادبی رسائل میں جگہ پانے لگی۔ اس مقام تک پہنچنے کے لیے میں شکر گزار ہوں اپنی چھوٹی بہن کے شوہر منظر اعجاز صاحب کی۔ ادب کی دنیا میں ان کی شخصیت محتاج تعارف نہیں ہے۔ پیشے کے لحاظ سے وہ اے۔ این۔ کالج پٹنہ میں لکچرر و صدر شعبہء اردو ہیں اور فن کے اعتبار سے ایک قادر الکلام شاعر اور جانے مانے تنقید نگار بھی ہیں۔ ادبی رسائل میں ان کے ادبی فیچرز اور تنقیدی مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔ واضح ہو کہ موصوف کی متعدد تنقیدی کتابیں بھی منظر عام پر آچکی ہیں۔

اس کے ساتھ ہی میں اپنے پیارے بھائی اقبال حسن آزاد کی بھی ممنون ہوں۔ مجھے خوشی کے ساتھ اعتراف ہے کہ وہ صفِ اول کے افسانہ نگار ہیں اور بطور شغل

وہ بھاگل پور یونیورسیٹی کے تحت ایک کالج میں ریڈر و صدر شعبۂ اردو ہیں۔ اب تک ان کے ڈھیر سارے افسانے اور ادبی مضامین معتبر ادبی رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے دو افسانوی مجموعے ''قطرہ قطرہ احساس'' اور ''مردم گزیدہ'' زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر ادبی دنیا میں مقام پا چکے ہیں۔ یہی دو حضرات ہیں جنھوں نے مجھے ادبی دنیا سے روشناس کرایا اور ان ہی کی وساطت سے میں اپنے قارئین تک پہنچ سکی ہوں۔

''نقار خانہ'' میرا پہلا افسانوی مجموعہ ہے۔ اگر قارئین کی دعائیں شامل حال رہیں تو ممکن ہے آئندہ کچھ اور بہتر تخلیق ان کی خدمت میں پیش کر سکوں۔ میری یہ کاوش انشاء اللہ جاری رہے گی۔

☆☆☆

نوشابہ خاتون

سائبان

کہیں دور سے آتی ہوئی شہنائی کی آواز نے آج پھر اس کے خوابیدہ جذبات میں ہلچل مچادی تھی، جسے ان دس برسوں میں اس نے بڑی مشکلوں سے تھپک تھپک کر سلایا تھا۔اس نے پلٹ کر اپنے بغل والے بستر کی جانب دیکھا جو خالی پڑا تھا۔دل میں درد کی ایک خفیف سی لہر اُٹھی جسے دبا کر اس نے سوچا' کیا فرق پڑتا ہے۔تو پھر یہ طلب' یہ تڑپ' یہ خلش' یہ اضطراب کیوں؟ کچھ پانے کی آرزو کیوں' کچھ کھونے کا دکھ کیوں؟

اس کے سارے خواب توڑدی کاغذ کے ٹکروں کی طرح بکھر چکے تھے۔

اس نے بھی ہر لڑکی کی طرح بہت سارے سہانے سپنے سجائے تھے۔اپنے صنم کا ایک حسین خاکہ ذہن میں مرتب کیا تھا' جو جاگتے میں اس کے خیالوں میں آتا اور سوتے میں اسے خوابوں سے جگاتا۔کہتے ہیں جہاں بیری کے پیڑ ہوتے ہیں وہاں ڈھیلے آتے ہی ہیں' لیکن اپنی زندگی کی بائیس بہاریں دیکھنے کے بعد بھی اب تک اس کے آنگن میں ایک کنکری تک نہ آئی تھی' کیونکہ جہیز کے لیے اس کے والد کے پاس

بھاری رقم نہ تھی۔ سفید پوشی کا صرف بھرم تھا، جو کسی سے بھی پوشیدہ نہ تھا۔ افلاس کی چکی میں پسا ہوا انسان اپنی اولاد کو اچھے طور طریقے، اچھی تربیت تو دے سکتا ہے، لیکن ان لالچی اور ہوس پرست لوگوں کے خندق جیسے پیٹ کو بھرنا اس کے لیے ناممکن ہوتا ہے۔

وقت دبے قدموں گزرتا جا رہا تھا۔ عمر بڑھتی جا رہی تھی، ساتھ ہی ساتھ مایوسیاں بھی بڑھتی جا رہی تھیں، لیکن بالآخر ایک دن ایک رشتہ آ ہی گیا.... ایک بڑی خامی کے ساتھ۔ چیچک کے ایک شدید حملے نے اس لڑکے کو ایک بڑی نعمت سے محروم کر دیا تھا۔ اس کی دونوں آنکھیں بے نور ہو چکی تھیں۔ جب اس نے سنا تو جیسے اس پر بجلی سی گر پڑی، جس نے اس کے سارے خواب، سارے ارمان جلا کر خاک کر دیے، لیکن وہ انکار نہ کر سکی، کیونکہ وہ اپنے والدین کی پریشانیوں میں اضافہ کرنا نہیں چاہتی تھی۔ ان کی الجھنیں بڑھانا اسے گوارا نہ تھا، اس لیے اس نے اس رشتے کو منظور کر لیا، لیکن اس کی ہنستی کھیلتی زندگی مٹی کی مورت بن گئی۔

جب سہیلیاں سہاگ کے گیت گاتیں تو اسے ایسا محسوس ہوتا جیسے کوئی مرثیہ پڑھا جا رہا ہو۔

وہ حجلۂ عروسی میں بیٹھی مایوسیوں کے بھنور میں ڈوب اور اُبھر رہی تھی۔ جذبات کی دنیا میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ دل کی دھڑکنیں بے ترتیب تھیں۔ کاش کوئی ایسا حادثہ ہو جائے کہ نہ میں رہوں نہ میرے خواب اور نہ میرے ارمان۔ رہ رہ کر یہ خواہش اس کے اندر بیدار ہو رہی تھی۔

دولہے کو اس کے دوستوں نے حجلۂ عروسی کے دروازے تک پہنچا دیا۔ اندر وہ ایک چھڑی کے سہارے داخل ہوا۔ بار بار وہ چھڑی کو لہرا کر کمرے کی پوزیشن کا اندازہ لگا رہا تھا۔ کسی طرح وہ اس جگہ پہنچ گیا جہاں دلہن بیٹھی تھی۔ دلہن نے نظریں اُٹھا کر دیکھا اور غش کھاتے کھاتے بچی۔ آنکھوں کی خامی کو تو اس نے سیاہ چشمے سے چھپا لیا تھا، لیکن

چیچک کے بے شمار داغوں نے اس کے چہرے کے خدوخال کو بالکل مسخ کر دیا تھا۔ جلد کھردری اور شکن آلود ہوگئی تھی۔ چہرہ شادابی اور کشش سے محروم تھا۔

کیا یہی ہے اس کے سپنوں کا شہزادہ.....؟ دل میں نفرت کی ایک شدید لہر اُٹھی اور آنسوؤں کی لڑیاں اس کے دامن میں جذب ہوتی چلی گئیں۔ کچھ دیر اُن دونوں کے درمیان خاموشی چھائی رہی۔ پھر اس نے ٹٹول کر اپنی منکوحہ کی موجودگی کو محسوس کیا۔

''یقیناً تم بہت خوبصورت ہوگی' لیکن میرا یہ المیہ ہے کہ میں تم کو دیکھ نہیں سکتا۔ آج میں بے حد خوش ہوں اور وعدہ کرتا ہوں کہ تمھیں اتنی خوشیاں دوں گا کہ تم اپنی ساری محرومیوں کو بھول جاؤ گی۔''

''ہونہہ! یہ مجھے کیا خوشیاں دے گا۔ اس کے ساتھ چلتے ہوئے دیکھ کر لوگ مجھ پر ترس کھائیں گے۔ میری قسمت پر افسوس کریں گے۔ ہر محفل' ہر تقریب میں میں احساس کمتری میں مبتلا رہوں گی۔ اس سے بہتر ہے کہ میں ساری دلچسپیوں سے منہہ موڑ کر گوشہ نشینی اختیار کرلوں۔'' اس نے دل ہی دل میں سوچا۔

''تم خاموش کیوں ہو؟ کچھ بولتی کیوں نہیں؟ کیا اس شادی سے تم خوش نہیں ہو؟''

اس کا دل چاہ رہا تھا کہ قہقہے لگا کر کہے کہ بھلا اندھیرے کنویں میں گر کر بھی کوئی خوش رہ سکتا ہے؟

''یقین مانو' میں پھول کی طرح تمھیں اپنے بیڈروم میں سجا کر رکھوں گا۔''

''جیسے میں کوئی شوپیس یا گلدستہ ہوں۔'' اس نے ناگواری کے ساتھ سوچا۔ اب نہ کوئی اُمنگ تھی' نہ جوش' نہ ولولہ۔ ایک لاش کی طرح اس نے خود کو شوہر کے سپرد کر دیا۔

دوسرے دن اس نے اپنا سارا سنگار اُتار دیا۔ کس کے لیے سجوں؟ کون ہے

دیکھنے والا؟

''تم نے چوڑیاں کیوں اُتار دیں؟'' شوہر نے سونی کلائی کا اندازہ لگا کر پوچھا۔ وہ خاموش رہی۔ مگر بار بار ایک ہی سوال سن کر جھنجھلا اُٹھی۔

''کیوں پہنوں چوڑیاں؟ ہے کوئی آنکھوں والا جو انھیں دیکھے؟'' اور چوڑی کی کرچیوں نے اس شخص کے احساس کو لہولہان کر دیا۔

جب وہ اسے تفریح کے لیے کہیں لے جانا چاہتا تو وہ انکار کر دیتی۔ اسے خود کو تماشا بنانا گوارا نہ تھا۔ جب کبھی وہ اسے آواز دیتا تو سنی ان سنی کر دیتی۔ شوہر کی پکار پر اسے بے طرح غصہ آجاتا۔ کبھی وہ لڑکھڑا کر گر جاتا تو اس کا دل قہقہے لگانے لگتا۔ نہ جانے اس کے دل کو ایسا کرنے سے کون سا سکون حاصل ہوتا تھا۔

خدا جب کسی سے بصارت' سماعت یا قوتِ گویائی چھین لیتا ہے تو اسے آگہی کی غیر معمولی طاقت عطا کر دیتا ہے۔ وہ اسی طاقت کے سہارے بیوی کے چہرے پر چھائی ناگواری' بےزاری اور الجھنیں دیکھتا رہتا۔ اس کا دل چاہتا کہ وہ اپنی شریک زندگی سے بہت ساری باتیں کرے اور وہ سب پوچھے جو اس کے دل میں سوال بن کر بار بار اکسا رہا تھا۔

''کیوں آئی تم میری زندگی میں؟ کیوں میرے خوابیدہ ارمانوں کو جگا دیا؟
کیوں ازدواجی لذتوں سے آشنا کر کے پل پل مجھے موت کی طرف گھسیٹ رہی ہو؟
کیوں میرا چین سکون چھین لیا؟ کیوں' آخر کیوں؟''

لیکن اس نے اپنے ہونٹوں پر قفل ڈال لیا تھا کہ وہ اپنی طبیعت کو مزید مکدر کرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ کھویا کھویا اور خاموش سا رہنے لگا۔ اس کی یہ کیفیت دیکھ کر کبھی کبھی وہ اپنے رویئے پر شرمساری ہو جاتی۔ اسے لگتا جیسے اس کے اندر سے بار بار یہ آواز آرہی ہے۔

''آخر تم اس کے ساتھ ایسا ناروا سلوک کیوں کرتی ہو؟ وہ تمھارا مجازی خدا ہے، تمھارا سائبان، تمھارا محافظ۔'' لیکن فوراً ہی ایک دوسری آواز اس کے کانوں سے ٹکراتی۔

''ہونہہ! سائبان' محافظ؟ جو اپنی حفاظت نہیں کر سکتا وہ بھلا دوسروں کا محافظ کیسے بن سکتا ہے؟'' پھر پہلی آواز آتی۔

''مت سوچو ایسا۔ ظاہری حسن پر مت جاؤ۔ دیکھو تو سہی' اس کا دل کتنا خوبصورت ہے۔ چھوڑ دو نفرت.....''

''کیسے چھوڑ دوں؟ وہ شہزادہ جو ہر وقت میری نظروں کے آگے رہتا تھا وہ آج بھی میرے دل کے سنگھاسن پر براجمان ہے۔''

ہمہ وقت اس دل کے اندر یہ تکرار ہوتی رہتی۔

اب وہ دیر تک گھر سے باہر رہتا۔ کبھی کبھی گھنٹوں اپنی بے نور آنکھوں سے چھت کو گھورتا رہتا۔ وہ چھت جو اس کے والدین نے اپنے اپاہج بیٹے پر ترس کھا کر اس کے نام کر دی تھی۔ اسے سر چھپانے کا آسرا دے دیا تھا۔ وہ اندھوں کے اسکول میں پڑھاتا تھا' جس سے دو وقت کی روٹی تو مہیا ہو جاتی تھی' لیکن وہ پیار جو انسان کی زندگی اور صحت کے لیے ٹانک کا کام کرتا ہے' اسے وہ کس دکان سے خریدے؟ وہ ہر وقت یہی سوچتا رہتا۔

ایک دن اس نے اپنی بیوی کو بتایا کہ وہ ایک ضروری کام کے سلسلے میں ایک ہفتے کے لیے باہر جا رہا ہے۔

پھر ایک ہفتہ بعد اس کا مختصر سا خط ملا۔ اس نے لکھا تھا۔

''یقیناً یہ خبر تمھارے لیے خوشی اور طمانیت کا باعث ہو گی کہ تمھیں زندگی کے اس عذاب اور ہیجانی کیفیت سے چھٹکارا دلانے کے لیے میں تمھاری زندگی سے بہت

دور آ گیا ہوں.....کبھی نہ واپس جانے کے لیے۔"

خط پڑھتے ہی اسے ایسا لگا کہ اس کے سر سے چھت سرک گئی ہو اور کڑی دھوپ میں اس کا بدن جھلسا جا رہا ہو۔ اس وقت سے لے کر آج تک وہ اس تپش میں جھلستی آ رہی تھی۔ کبھی پلٹ کر جب وہ اپنے پاس والے بستر کی جانب دیکھتی تو خالی پن کا احساس اسے بے چین کر دیتا۔ ایسا لگتا جیسا وہ ایک خالی گھڑا ہے جو کسی بھی وقت لڑھک کر نشیب میں گر سکتا ہے۔ جب کبھی شہنائی کی آواز آتی تو اس کے جذبات میں تلاطم سا برپا ہو جاتا۔ وہ اس کیفیت سے نکلنا چاہتی تھی، مگر ہزار کوششوں کے باوجود نکل نہیں پا رہی تھی۔

پھر اچانک پورے دس برسوں کے بعد وہ آن موجود ہوا۔ ان دس برسوں نے اس کے چہرے پر کوئی منفی اثر نہیں ڈالا تھا، بلکہ وہ پہلے سے زیادہ تندرست اور توانا ہو گیا تھا۔ شکن آلود چہرہ شادابی کی طرف مائل تھا۔ پُر وقار شخصیت اور خوبصورت مسکراہٹ کے ساتھ وہ سامنے کھڑا تھا۔ اب کسی بھی زاویے سے وہ بدصورت کہلانے کے لائق نہ تھا، بلکہ اس کی نظروں میں اس وقت وہ دنیا کا حسین ترین مرد لگ رہا تھا۔ وہ اس کے استقبال کے لیے بے اختیار آگے بڑھی لیکن کسی احساس کے تحت ٹھٹھک کر رک گئی۔ پھر پل بھر میں برسوں کا فاصلہ عبور کر کے اس نے بے ساختہ اس کا ہاتھ تھام لیا، جیسے کہہ رہی ہو۔

"اب چھوڑ کر کبھی نہ جانا۔" مرد نے اپنا ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیا، اور تب اسے ایسا لگا کہ زندگی کی تپتی دھوپ میں ابر کا ایک مہربان ٹکڑا اس کے سر پر آ گیا ہو۔

☆☆☆

پکھیرو

وہ ایک ایک دیوار ایک ایک دریچہ اور محراب کو بڑی حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا جنھیں اس نے اپنے خون پسینہ سے سینچا تھا۔ گھر کی ایک ایک اینٹ میں اس کے پسینے کی خوشبو بسی تھی ۔ یہ اس کا روز کا معمول تھا۔ صبح اٹھتا، درو دیوار کو حسرت سے دیکھتا۔ ایک ایک چیز کو جھاڑتا' پوچھتا' سجاتا۔ ایسا کرتے ہوئے اسے ایک خاص قسم کی لذت اور طمانیت کا احساس ہوتا۔ محراب کو جھاڑتے ہوئے اس نے دیکھا کہ محراب کے نیچے والی طاق میں اس بار پھر چڑیوں نے گھونسلہ بنانا شروع کر دیا ہے۔ وہ صبح سے شام تک تنکے چن چن کر لاتیں اور اپنا آشیانہ بناتیں۔ جب گھونسلہ تیار ہو گیا تو ایک چڑیا نے دو انڈے دیے۔ ان انڈوں سے دو بچے نکلے۔ بچے کیا تھے بس گوشت کے لوتھڑے جن کی سیوا میں دونوں نر مادہ لگے تھے۔

یہ فطرت کا تقاضا ہے' ممتا کا بے لوث جذبہ ہے' جسے قدرت نے ہر ذی روح کو عطا کیا ہے۔ گویا زندگی خدا کے بعد ماں باپ کا دیا ہوا انمول عطیہ ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا

تو دنیا کی آبادی میں آج اتنا اضافہ ہوا ہوتا۔

دونوں نر مادہ باری باری چرنے چگنے کے لیے جاتے۔ ایک جاتا تو دوسرا بچوں کی حفاظت کرتا۔ دشمنوں کے حملوں سے بچانے کے لیے اسے اپنے پروں میں سمیٹ لیتا۔ سیوسیو کر اسے بڑا کیا۔ یہاں تک کہ ان کے پر نکلنے لگے اور جب پوری طرح پر نکل آئے' وہ اڑنے کے لائق ہو گئے تو ایک دن پھر سے اڑ گئے۔ اپنا گھونسلہ کہیں اور آباد کر لیا۔

وہ بڑے ہی انہماک سے چڑیوں کی ان حرکات وسکنات کو دیکھ رہا تھا۔ دیکھتے دیکھتے کہیں کھو گیا' ماضی میں گم ہو گیا۔

چار دنوں سے مسلسل بارش ہو رہی تھی۔ ہوا بھی طوفانی تھی۔ پورا علاقہ جل تھل ہوا تھا۔ بادوباراں کے زوردار تھپیڑوں نے اس کی جھونپڑی کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ کہیں سے ٹین کھسک گیا تھا تو کہیں سے پھوس اڑ گئی تھی اور کہیں پلاسٹک اڑ کر دور جا گری تھی۔ بارش کی بوچھار جھونپڑی کے اندر تیزی سے آنے لگی تھی۔ کہیں تل رکھنے کی جگہ نہیں تھی۔ بس ایک پلنگ بھر جگہ بچی ہوئی تھی جس پر بیک وقت تین افراد نہیں سو سکتے تھے۔ جب بیوی بچے کو لے کر سوتی تو وہ بیٹھا رہتا۔ جب وہ لیٹتا تو بیوی بیٹھی رہتی۔ کھانے پینے کی چیزیں ختم ہو رہی تھیں۔ انھیں بچے کی بڑی فکر تھی۔

''منا کے بابا!'' اس نے اونگھتے ہوئے شوہر کو مخاطب کیا۔

''اب کی برسات ختم ہوتے ہی ایک کوٹھری کا بندوبست کیجیو۔ اس جھونپڑی میں تو ہم مر جائیں گے۔ اپنا نہیں تو بچے کا خیال کرو۔''

''تم کیا سمجھتی ہو کہ مجھے بچے کا دھیان نہیں ہے۔ مجھے خود اس کی فکر ہے۔ پر کیا کروں' جیب ساتھ نہیں دیتی۔''

''اب دیکھو نا کھانے پینے کا سامان ختم ہو رہا ہے۔ پانی کا زور کم ہونے کا نام

ہی نہیں لے رہا۔آس پاس کوئی دکان بھی نہیں ہے'ایسے میں بچہ تو بھوکا ہی مر جائے گا۔''

خدا خدا کر کے بارش کا زور تھم گیا۔ زندگی معمول پر آ گئی۔ وہ بھی کام پر جانے لگا۔ وہ ایک کارخانے میں منشی تھا۔ بہت ہی کم تنخواہ تھی۔ بڑی مشکل سے تین افراد کا گزر بسر ہو رہا تھا اور اب ایک کوٹھری کی فکر بھی ہو رہی تھی۔ کوٹھری کا مالک چھ ماہ کا ایڈوانس مانگ رہا تھا۔اس نے بھی اپنے مالک کو ایڈوانس کے لیے عرضی دے دی تھی' لیکن ایک منشی کو ہزار روپے ایڈوانس ملنا مشکل تھا۔

بہت ہی سوچ بچار کے بعد اس نے ایک ٹھیلا کرایے پر لیا جس پر کچھ سبزیاں اور پھل رکھ کر گنجان آبادی والے نکڑ پر بیچنے لگا۔ صبح پانچ بجے اپنا ٹھیلا لگاتا' نو بجے کارخانہ جاتا۔ وہاں سے واپس آ کر پھر رات کے گیارہ بجے تک سبزیاں اور پھل فروخت کرتا۔ جوڑ جوڑ کر اس نے اتنا پیسہ جمع کر لیا کہ برسات آنے سے قبل ایک کوٹھری کرایے پر لے لی۔

کوٹھری میں آنے کے بعد اس کی رہائش قدرے بہتر ہو گئی۔ فراغت ہونے پر ایک بچے نے اور جنم لیا۔

وہ بچوں کو بڑے جتن سے پال رہا تھا۔ کھان پان سے لے کر پڑھائی لکھائی میں بھی کوئی کوتاہی نہیں کرتا تھا۔ بچوں کی نت نئی فرمائشیں پوری کرتا۔ بڑے بیٹے نے کہا۔

''بابا اس جاڑے میں مجھے نیا کوٹ چاہئے۔ اب پرانا سوئٹر نہیں پہنوں گا۔ میرے دوست میرا مذاق اڑاتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے بن جائے گا تو کیوں فکر کرتا ہے''' لیکن وہ خود فکر میں ڈوب گیا۔ کہیں نہ کہیں سے کوٹ کے لیے پیسہ کا انتظام تو کرنا ہی پڑے گا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ بچے کو ٹھنڈ لگ جائے۔ دیکھتا ہوں شاید مالک تھوڑا ایڈوانس دینے کے لیے راضی ہو جائے۔

ابھی وہ فکر میں ڈوبا ہی تھا کہ چھوٹے بیٹے نے کہا۔

''بابا میرے سارے کپڑے پرانے ہو گئے ہیں مجھے نئی شرٹ چاہئے۔''

''وہ بھی بن جائے گی۔ تجھے فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ابھی میں زندہ ہوں۔''

وہ بچوں سے زیادہ خود کو باور کرانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس کے ہوتے ہوئے بچوں کو کوئی تکلیف نہیں ہونی چاہئے۔

''بابا مجھے یہ چاہئے' بابا مجھے وہ چاہئے۔'' اس طرح فرمائشوں کا بلسلہ جاری رہتا۔ اس نے کبھی بیٹوں کی فرمائشوں کو رد نہیں کیا تھا کہ وہی تو اس کے مستقبل تھے۔ حالات کچھ بہتر ہوئے تو حوصلہ بھی بلند ہوا۔ اس نے اور زیادہ محنت کرنی شروع کر دی اور اتنا کچھ حاصل کر لیا کہ زمین کا ایک چھوٹا سا پلاٹ خرید لیا۔ پھر دھیرے دھیرے مکان کی تعمیر کا کام شرع ہو گیا۔ بڑی لگن اور بہت ہی محنت مشقت سے اس نے اپنا مکان مکمل کیا' لیکن مکان اسے راس نہ آیا۔ بیوی داغ مفارقت دے گئی۔ گاڑی کا ایک پہیہ ٹوٹ چکا تھا' اب اسے ایک ہی پہیہ سے زندگی کی گاڑی کھینچنی تھی۔ لڑکے دونوں بڑے ہو چکے تھے۔ لیکن ان کا انداز جداگانہ تھا۔ انہوں نے باپ کو محنت مشقت کرتے دیکھا تھا' لیکن خود اس کا مزہ نہیں چکھا تھا۔ وہ بڑے ہی ناز و نعم میں پلے تھے۔ ان کی ہر خواہش' ہر خوشی پر باپ نے خود کو قربان کر دیا اور اب بیوی کی جدائی اور جان توڑ محنت نے اسے قبل از وقت بوڑھا کر دیا تھا۔ لیکن اپنے بچوں کو دیکھ کر وہ تازہ دم ہو جاتا۔ ساری تھکاوٹیں' سارے دکھ بھول جاتا اور ایک روز تو اس کے پورے جسم میں ایک عجیب سی توانائی بھر گئی تھی۔ وہ برسر روزگار ہو گئے تھے۔ اب اسے کسی بات کی فکر کرنے کی ضرورت نہ تھی' لیکن ایک بات کا دکھ تھا کہ وہ دونوں اس سے جدا ہو کر دور چلے گئے تھے۔

پھر بھی وہ سوچ رہا تھا کہ چند دنوں کی تو بات ہے۔ بہت جلد بہوئیں آئیں گی'

پوتے پوتیاں ہوں گی تو یہ گھر آباد ہو جائے گا۔ بہوئیں بھی آئیں۔ پوتے پوتیاں بھی ہوئیں، لیکن گھر آباد نہ ہو سکا۔ بیٹے اور دور ہوتے ہو گئے۔

ایک دن اس نے دونوں بیٹوں سے کہا۔

''بیٹا! اب میں بہت بوڑھا ہو گیا ہوں۔ بیمار بھی رہنے لگا ہوں۔ کوئی دیکھنے والا نہیں ہے۔ وقت کاٹے نہیں کٹتا۔ گھر کاٹنے کو دوڑتا ہے۔ اس لیے سوچ رہا ہوں کہ اس گھر کو کرایے پر اٹھا دوں اور تمہارے ساتھ ہی رہوں۔''

باپ کی بات سنتے ہی دونوں بیٹے ایک دوسرے کا منہہ دیکھنے لگے۔ بڑا بیٹا تو خاموش ہی رہا۔ چھوٹے نے کہا۔

''ٹھیک ہے ابھی میں پوری طرح سیٹل نہیں ہوا ہوں۔ جب سیٹل ہو جاؤں گا تو آپ کو اپنے پاس بلا لوں گا۔''

پھر جب بھی وہ دونوں فون کرتے یا گھر آتے تو وہ بڑی آس بھری نظروں سے انھیں دیکھتا کہ شاید اس بار وہ انھیں اپنے ساتھ لے جانے کی بات کریں، لیکن ہر بار وہ ہفتہ دو ہفتہ سیر و تفریح کر کے چلے جاتے اور وہ حسرت بھری نگاہوں سے انھیں دیکھتا رہ جاتا، لیکن آج چڑیوں کی کہانی نے اس پر یہ حقیقت عیاں کر دی کہ قانون قدرت یہی ہے، یہی دنیا کا دستور ہے، پھر بھی وہ سوچ رہا تھا کہ حیوان اور انسان میں کچھ فرق ہونا چاہئے کیونکہ انسان کو تو اشرف المخلوقات کہا گیا ہے۔

☆☆☆

نوشابہ خاتون

آخری کہانی

وہ اپنے کمرے میں تنہا بیٹھا سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔ کبھی کبھی اضطراری حالت میں ٹہلنے لگتا۔ رات بہت تاریک اور خاموش تھی۔ یا شاید اسے اپنے اندر کا سناٹا پوری فضا پر چھایا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

وہ ایک کہانی کار تھا۔ کہانی لکھنا اس کا دلچسپ مشغلہ اور تنہائی دور کرنے کا ایک ذریعہ بھی تھا کہ وہ تو اپنی ازدواجی زندگی کے ابتدائی دور سے ہی تنہا تھا اور آج بھی تنہا ہے۔ اس نے لاتعداد کہانیاں لکھیں جو بے حد مقبول ہوئیں۔ قارئین کے تعریفی اور فرمائشی خطوط برابر آتے رہے۔ اب بھی کئی رسالے والوں کی فرمائشیں آئی تھیں۔ لیکن آج اسے کوئی پلاٹ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اس نے سوچا کیوں نہ اپنی زندگی کی کہانی ہی لکھ ڈالے تاکہ اندر کی گھٹن اور درد میں قدرے کمی آ جائے۔ وہ اپنی کہانی کو ترتیب دینے لگا۔

وہ متوسط طبقے کا ایک ذہین اسٹوڈنٹ تھا۔ اپنے والدین کی پہلی اولاد۔ ماں باپ کو اس پر ناز تھا اور اس سے بہت ساری امیدیں وابستہ تھیں انھیں۔ کثیر الاولاد ہونے کے باوجود

انہوں نے اس کی تعلیم میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی ۔ اپنی ضروریات کم کر کے اس کے تعلیمی اخراجات پورے کرتے رہے کہ اس طبقے کے لوگوں کی اولاد ہی ان کی زندگی ہوتی ہے۔

اس وقت وہ ایم اے کا اسٹوڈنٹ تھا۔ وہ کوئی دل پھینک یا لڑکیوں میں زیادہ دلچسپی لینے والا شخص نہ تھا لیکن نہ جانے نائلہ کی کون سی ادا اسے بھا گئی۔ شاید اس کی تیزی طراری یا انفرادیت نے اسے متاثر کیا تھا۔ پہلے تو دونوں کی نگاہوں میں ایک دوسرے کے لیے پسندیدگی نمایاں ہوئی ۔ پھر مکالموں کا تبادلہ ہوا۔ پھر مراسم کچھ بڑھے اور پھر بڑھتے ہی گئے اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ دونوں نے ایک دوسرے کو رفیق حیات بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ کبھی کبھی وہ بے حد پریشان ہو جاتا۔

''کیا یہ اونچے طبقے کی لڑکی اس کے گھر' اس کے ماحول میں ایڈجسٹ کر پائے گی؟''

وہ خود سے بار بار سوال کرتا۔ لیکن شاید اسے نائلہ سے عشق ہو گیا تھا اور یہ تو ایسا جنون ہے جو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ اچھے اچھے عقل والوں کی عقل سلب کر لیتا ہے' بصیرت چھین لیتا ہے۔

جب اس نے اپنی اس خواہش کا اظہار والدین سے کیا تو وہ ششدر رہ گئے زبان سے کچھ نہ کہا لیکن ان کے چہرے پر چھائی ہوئی یاسیت ان کی دلی کیفیت کو عیاں کر رہی تھی ۔ مخالفت میں انھوں نے ایک لفظ نہ کہا۔ یہ سوچ کر کہ ہر انسان کی اپنی مرضی ہوتی ہے اور اسے اپنی راہ متعین کرنے کا حق حاصل ہے۔ لیکن انھیں تھوڑی سی مہلت درکار تھی کہ ان کے گھر بیٹی جوان ہو چکی تھی اور معاشرے نظریں اس پر ٹکی تھیں۔ جس گھر میں بیٹی جوان ہو جائے اور ماں باپ اسے رخصت کرنے میں دیر کریں تو معاشرہ انھیں کب بخشتا ہے۔ لیکن اس کی سوچ تو خود تک محدود تھی ۔ ماں باپ بھائی بہن سب پس پشت پڑ چکے تھے ۔ والدین نے موقع کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے اس کی خواہش کے مطابق بحسن خوبی

اس فرض کو انجام دے دیا۔ ایم اے تو وہ کر ہی چکا تھا' پوزیشن بھی لایا تھا پھر مقابلے کے دو چار امتحانات کے بعد اسے گزیٹیڈ پوسٹ مل گئی اور اس نے اپنی دنیا الگ بسالی۔

کچھ دن تو چاؤ چونچلے اور سیر وتفریح میں گزر گئے لیکن پھر چھوٹی چھوٹی باتوں میں نااتفاقیاں پیدا ہونے لگیں۔ اور دھیرے دھیرے یہ شدت اختیار کرتی گئیں۔ زیادہ اختلاف ان دونوں کے بیچ اس بات پر تھا کہ نائلہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ اپنے گھر والوں سے تعلقات زیادہ استوار رکھے لیکن پھر بھی موقع ملنے پر وہ گھر ضرور جاتا۔ اپنے گھر کی خستہ حالی دیکھ کر اسے کوفت ہوتی۔ والد کی بیماری اور ماں کی کراہ سن کر اذیت ہوتی۔ بھائی بہن کی مسکین شکل دیکھ کر اس کے اندر کہیں کچھ ٹوٹ جاتا۔ لیکن وہ ان لوگوں کی حالت بدلنے سے قاصر تھا کہ بیوی اس پر پوری طرح سے حاوی ہو چکی تھی۔ اسے اپنی دولت اور اسٹیٹس کے شکنجے میں جکڑ لیا تھا۔ اسے اس بات کا بے حد احساس اور گھمنڈ تھا کہ وہ ایک اونچے طبقے سے تعلق رکھتی ہے۔ غرور اسکی نس نس میں بھرا تھا۔ وہ اس کے گھر والوں کو قلاش' بھکاری اور نہ جانے کن کن خطابوں سے نوازتی رہتی۔ یہ سب سن کر اس کا خون کھول جاتا۔ اس کا دل چاہتا کہ اسے اپنی زندگی سے نکال باہر کرے۔ لیکن وہ شریف النفس والدین کی اولاد تھا۔ وہ اس بات کا ارتکاب کیسے کرتا جو خدا کے نزدیک سب سے زیادہ ناپسندیدہ فعل ہے۔

اس بیچ اس کے گھر ایک بچی کی پیدائش ہوئی۔ وہ بے حد خوش تھا۔ ساری نااتفاقیاں بھلا دیں اس نے۔ اس نے سوچا اب یہی بچی اس کی خوشیوں اور دلچسپیوں کا مرکز ہوگی۔ وہ اس کی ذات میں اپنی ہستی کو ڈبو دینا چاہتا تھا۔ اسے لگتا اب یہی بچی ماں باپ کے رشتے کی ڈور کو مضبوط اور زندگی کو خوشگوار بنائے گی لیکن یہ جذبہ ایک طرفہ تھا۔ دوسری طرف کوئی مثبت ردعمل نہ تھا۔ اس تناؤ بھرے ماحول میں بچی کی پرورش ہوتی رہی' اور اب وہ اتنی بڑی ہوگئی تھی کہ اسکول میں اس کا داخلہ ہو گیا۔ وہ بہت ہی ذہین تھی۔ ماں باپ دونوں کی طرف سے وراثت میں اسے یہ تحفہ ملا تھا اور دونوں ہی بچی کی

اس خصوصیت پر نازاں تھے۔ لیکن ادھر کئی دنوں سے دونوں کے بیچ سرد جنگ چل رہی تھی۔ وجہ بے بی تھی۔ نائلہ اسے بورڈنگ میں ڈالنا چاہتی تھی۔ اور اسے یہ بالکل گوارا نہ تھا۔ وہ اپنے گھر کی اس رونق کو باہر کرنا نہیں چاہتا تھا۔ فقط وہی تو ایک اس کی دلبستگی کا سامان تھی۔ جب وہ تھکا ہارا آفس سے واپس آتا تو اس کی پیاری پیاری اداؤں میں ڈوب ڈوب جاتا۔ لیکن نائلہ بضد تھی۔ اس نے اپنی خواہشوں کے آگے دوسروں کی خواہش کا احترام کرنا کب سیکھا تھا۔ یہ ظرف تو اسکی فطرت میں تھا ہی نہیں۔ اس کا کہنا تھا کہ گھر میں اس کی تعلیم و تربیت اچھی نہیں ہوسکتی۔ اس مکدر ماحول میں اس کی ذہنی نشو ونما صحیح طور پر نہیں ہوسکتی اور وہ سوچتا کہ اس کا ذمہ دار کون ہے؟

ماں کی آغوش اور گھر کا ماحول ہی تو بچے کی سب سے پہلی اور سب سے اچھی تربیت گاہ ہوتی ہے لیکن اسے کون سمجھائے۔ آخر اس نے ہار مان لی۔ اور یہ کون سی نئی بات تھی۔ گھر کے سکون کو برقرار رکھنے کے لیے وہ ہمیشہ ہتھیار ڈال دیا کرتا تھا۔

اس نے ایک اور مات کھائی، لیکن دل کو دلاسا دیتا رہا۔ منتشر ذہن کو سمیٹتا رہا۔ سگریٹ کے دھوئیں کے ساتھ غم کے گھونٹ پیتا رہا۔ گرتا رہا، سنبھلتا رہا اور وقت اسی طرح گزرتا رہا۔

اس روز وہ بے حد خوش تھا۔ اس کی بیٹی گھر آنے والی تھی۔ ڈیڑھ ماہ کے لیے ہاسٹل بند ہونے والا تھا۔ دو دنوں سے بیوی میکے گئی ہوئی تھی اور وہ بہت ہی سکون محسوس کر رہا تھا۔ اس نے بہت سارے کھلونے خریدے اور لدا پھندا ہاسٹل پہنچا۔ وہاں پہنچ کر اسے معلوم ہوا کہ بچی کو اس کی ممی کل ہی وہاں سے لے گئی۔ کھلونے اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گئے اور اس کا سارا جوش صابن کے جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ تو اب نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ اجازت اور مشورہ لینا تو درکنار وہ کسی بات کی خبر دینا بھی ضروری نہیں سمجھتی ہے۔ اس نے سیدھے سسرال کا رخ کیا۔ وہاں اسے ایک دھکا اور لگا یہ جان کر

کہ وہ بچی کو لے کر کسی ہل اسٹیشن چلی گئی ہے۔ اب زیادہ پوچھ تاچھ فضول تھی۔ وہ ہارے ہوئے جواری کی طرح واپس آ گیا اور پورے راستے یہی سوچتا رہا کہ اسے ٹارچر کرنے کا یہ کون سا انداز ہے۔ آخر وہ اس کی خوشیاں کیوں چھیننا چاہتی ہے۔ اس نے اس کا کیا بگاڑا ہے۔ تبھی بجلی کی سی تیز لپک اس کے ذہن میں کوندی اور ماں باپ کا مایوس چہرہ نظروں کے سامنے گھوم گیا۔ ہاں بیشک وہ ان کا خطا کار تھا۔ وہ اپنی غلطیوں، اپنے گناہوں کے بھنور میں ڈوبتا ابھرتا رہا۔ غم و غصہ کی شدت نے اسے بیمار کر دیا۔ ہفتوں وہ بخار میں جلتا رہا۔ تن تنہا بیماری سے جھوجھتا رہا۔ پھر کسی طرح لوٹ پوٹ کر ٹھیک ہو گیا لیکن بے حد اداس تھا۔ اسے خبر ملی تھی کہ اس کے والد کا انتقال ہو گیا ہے۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ اڑ کر ماں کے پاس پہنچ جائے لیکن اس کے قدم من من بھر کے ہو رہے تھے۔ کس منہ سے جاتا۔ باپ کی زندگی اور بیماری میں اس نے کون سا اپنا فرض نبھایا تھا۔ لیکن یہ احساس ہی اس بات کا ثبوت تھا کہ اس کا ضمیر ابھی زندہ ہے۔ وہ خود کو روک نہ سکا۔ سبھوں کے ساتھ غم میں شریک ہو کر دل کا بوجھ ہلکا ہوا۔ دل کو قدرے سکون ملا۔ ان لوگوں کے ساتھ رہ کر بہت ہی پرسکون رہا۔ لیکن وہاں سے واپس آنا اس کی مجبوری تھی۔ اب پھر وہی شب و روز، وہی تنہائی تھی۔ بیوی سے دلی اور ذہنی وابستگی گویا ختم ہو چکی تھی۔ وہ دونوں ایک ہی چھت کے نیچے دو اجنبیوں کی طرح زندگی گزار رہے تھے۔ نہ جانے کس کی آہ نے اس کی خوشیوں، دلچسپیوں اور حسین زندگی کو نگل لیا تھا۔ زندگی بے حد کٹھن، بے حد دشوار ہو گئی تھی۔ راستہ بہت ہی ناہموار تھا جس پر چل کر اسے زندگی کی الجھنوں کو سلجھاتے ہوئے وقت اتنا گزر گیا کہ اس کے سر کے آدھے سے زیادہ بال چاندی کے تاروں میں تبدیل ہو گئے۔ وقت اس قدر دبے قدموں نکل گیا کہ نہ کوئی دھمک نہ کوئی ہل چل سنائی دی۔ یہ احساس تو تب ہوا جب بیٹی جوان ہو گئی اور تعلیم سے فارغ ہو کر گھر آ گئی۔ لیکن اب اسے کسی بات، کسی چیز میں دلچسپی باقی نہ رہی تھی۔ بیٹی کی آخری ذمہ داری نبھانا اس کا فرض تھا اور وہ اپنی اس ذمہ داری

کو بحسن وخوبی نبھانا چاہتا تھا۔ بہت ساری اڑچنوں کے باوجود وہ اپنا فرض پورا کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ بیٹی کو رخصت کرتے وقت اس کے دل میں عجیب سی حسرتیں، عجیب سی بے چینیاں تھیں۔ وہ اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر صرف اتنا کہہ سکا۔

''خدا تمھیں ازدواجی زندگی کا سکھ اور خوشیاں عطا کرے۔ یہ سب سے بڑی دولت ہے۔ اس کے مقابل ساری چیزیں، ساری دولت بیکار ہے۔ اسے کبھی ہاتھ سے جانے نہ دینا۔ ایک نامراد باپ کی اس نصیحت کو گانٹھ میں باندھ کر رکھنا۔ اسی میں تمھاری بہتیری، فلاح و بہبودگی اور خدا کی خوشنودی ہے۔''

پھر وہ اسے لپٹا کر رودیا۔ برسوں کے رکے ہوئے آنسو سیل رواں بن گئے۔ بیٹی کے رخصت ہونے کے بعد بیوی نے بھی اس گھر کو خیر باد کہہ دیا۔ شاید وہ انتظار میں تھی۔ اب وہ مکمل طور پر تنہا ہوگیا تھا۔ اس کی کیفیت پاگلوں جیسی ہوگئی تھی۔ پورے گھر میں بولایا بولایا گھومتا رہتا۔ برسوں سے جو زہر قطرہ قطرہ اس کے وجود میں ٹپک رہا تھا وہ اب اپنا مہلک اثر دکھا رہا تھا۔ نہ جانے یہ کس کی بددعاؤں کا اثر تھا۔ اسے یاد آیا کہ اس نے کہیں پڑھا تھا کہ جب والدین کی آہ عرش تک جاتی ہے تو سب کچھ جلا کر خاک کر دیتی ہے۔ کاش وہ بھی جل کر خاک ہوجاتا۔ اس کا کوئی عضو بیکار ہوجاتا، وہ اپاہج ہوجاتا لیکن یہ تنہائی کا زہر نہ پینا پڑتا۔

اس کی کہانی اختتام پر پہنچ گئی تھی۔ رات کی سیاہی صبح کی سپیدی میں تبدیل ہورہی تھی۔ ہر سو روشنی پھیل رہی تھی لیکن اس کی زندگی کی تاریکیوں میں اب کبھی اجالا ہونے والا نہ تھا۔ اس نے تھکے تھکے انداز میں رجسٹر بند کیا۔ چشمہ اور قلم ٹیبل پر رکھتے ہوئے سر ٹیبل پر جھکا دیا۔ یہ اس کی آخری کہانی ہوگی کیونکہ اس کا ہر عضو جواب دے چکا تھا۔ ہاتھ، پاؤں، دل و دماغ سب کچھ معطل ہو چکے تھے۔

☆☆☆

خدا کی لاٹھی

انھیں دیکھ کر یہ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ وہی خاتون ہیں جن کی گردن غرور سے ہمیشہ تنی رہتی تھی۔ جنھوں نے کبھی کسی کے آگے جھکنا سیکھا ہی نہ تھا۔ وہ آج اس کیمپ میں نیم مردہ لاش کی طرح پڑی تھیں۔

اس کیمپ میں مریضوں کی دیکھ بھال کے لیے میری ڈیوٹی لگی تھی۔ جب صبح میں راؤنڈ پر نکلا تو ایک بیڈ کے پاس پہنچ کر ٹھٹھک گیا۔ مجھے چہرہ کچھ شناسا سا لگا۔ لیکن صحیح طور پر پہچاننا دشوار ہو رہا تھا کیونکہ مریضہ کا پورا جسم پٹیوں سے جکڑا تھا۔ چہرے کی جلد بھی جا بجا جھلس گئی تھی۔ جسم کا نچلا حصہ زیادہ متاثر تھا بنسبت اوپری حصے کے، اس لیے تھوڑا غور کرنے کے بعد میں انھیں پہچان کر دم بخود رہ گیا۔

عبرت کا مقام تھا۔ انسان کتنا بے بس اور لاچار ہے۔ شان اور کبر صرف خدا کی ذات کو ہی زیب دیتا ہے۔ انسان تو بھر بھری مٹی کا پتلا ہے جسے ذرا سی ٹھیس لگ جانے پر ٹوٹ نے کا اندیشہ ہے۔ پانی کا بلبلہ ہے جسے ثبات حاصل نہیں۔

درخت سے گرے ہوئے پتے کے مانند ہے' جسے ہوا کا ایک تند جھونکا کہاں سے کہاں پہنچا دیتا ہے۔ پھر اسے کس بات کا زعم؟

حالانکہ وہ یہ اچھی طرح جانتا ہے کہ زندگی چند روزہ ہے، اس کے یہ ہاتھ پاؤں' آنکھ' ناک' دل دماغ' مال و دولت' کسی چیز کو بھی دوام نہیں۔ پھر بھی نادان انسان اس بات پر غور نہیں کرتا۔

میں نے مریضہ کے پاس رک کر پوچھا ''آپ کی طبیعت کیسی ہے''

انہوں نے ذرا سی آنکھیں کھول کر دیکھا' پھر آنکھوں کو بند کر لیا۔

''آپ نے مجھے پہچانا نہیں؟ میں منا ہوں''۔

انھوں نے دوبارہ آنکھیں کھولیں۔

''کون منا؟''

''منا! آپ کی ملازمہ کا بیٹا''

''اوہ! تو تم مُنا ہو؟''

''جی اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟'' میں نے پھر اپنا سوال دہرایا۔

''کیا بتاؤں بیٹا' سانسیں گن ہی ہوں۔''

''بیٹا؟''

لفظ بیٹا نے میرے ذہن میں بہت ساری یادیں تازہ کر دیں۔ میری ماں ان کے گھر ملازمہ تھیں۔ وہ خاص طور سے بچوں کی دیکھ بھال کے لیے گئی تھیں۔

اس وقت میں بہت چھوٹا تھا لیکن مجھے سب کچھ یاد ہے۔ دبلا پتلا مریل سا۔ پھٹی ہوئی نیکر اور شرٹ میں میں اکثر وہاں جاتا۔ دیکھتے ہی کراہیت سے بیگم صاحبہ منہ پھیر لیتیں۔ اماں فوراً کچھ دے دلا کر مجھے چلتا کر دیتیں۔

ایک دن جب میں وہاں گیا تو اماں بچوں کو کھانا کھلا رہی تھیں۔ کھانے کی

اشتہا انگیز خوشبو نے میری بھوک جگا دی تھی۔ میں ہونٹوں پر زبان پھیرتا ہوا للچائی نظروں سے ادھر دیکھ رہا تھا۔ تب ہی بیگم صاحبہ کی گرجدار آواز آئی۔

''یہ یہاں کیا کر رہا ہے؟ ہٹاؤ اسے یہاں سے!''

میں ٹس مس نہ ہوا' بدستور کھڑا رہا پھر بیگم صاحب نے غصے سے کان پکڑ کر مجھے گھر سے باہر کر دیا۔ میں دیر تک بلک بلک کر روتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد اماں نے بہلا پھسلا کر مجھے گھر بھیج دیا۔ اس واقعہ کے بعد میں نے وہاں جانا کم کر دیا۔ مجھے بیگم صاحبہ کی غصیلی آنکھوں سے ڈر لگنے لگا تھا۔

کچھ دنوں بعد اماں نے اسکول میں میرا داخلہ کروا دیا تھا۔ بڑی مشکل سے انھوں نے جوڑ جاڑ کر میرا یونیفارم بنوایا تھا۔ اب میں قدرے بہتر حالت میں رہنے لگا۔ اور مجھ میں تھوڑی خود اعتمادی آ گئی تھی۔ اس روز بہت دنوں بعد میں وہاں گیا تھا۔ پہلے میں نے جھانک کر دیکھا، بیگم صاحبہ کہیں نظر نہ آئیں۔ میں اماں کو تلاش کرتا ہوا بچوں کے کمرے میں چلا گیا۔ وہ لوگ کیرم کھیل رہے تھے۔ میں بھی پاس بیٹھ کر کھیل سے لطف اندوز ہونے لگا۔ اسی وقت نہ جانے کہاں سے بیگم صاحبہ الہ دین کے چراغ والے جن کی طرح نمودار ہو گئیں۔ اور آتے ہی برس پڑیں۔

''تیری یہ مجال کہ بچوں کے ساتھ قالین پر بیٹھا ہے۔ تو نے خود کو سمجھا کیا ہے؟'' اور وہ کہاں ہے تیری اماں؟ بلا اسے۔''

میں گھبرا کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ اماں اندر داخل ہو رہی تھیں۔ میں نے سنا۔ بیگم صاحبہ کہہ رہی تھیں۔

''سمجھا دو اپنے بیٹے کو یہاں نہ آیا کرے۔ جب دیکھو آتا ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ گنوار اور چھوٹے لوگوں کی صحبت میں میرے بچوں کا ذہن خراب ہو۔ اگر اس

نے نہیں مانا تو سمجھ لو تمہاری چھٹی۔''

اس کے بعد میں وہاں کبھی نہیں گیا۔ اور دل میں ٹھان لیا کہ مجھے کچھ بن کر دکھانا ہے۔

لیکن میں اور کچھ تو بن نہ سکا ہاں میٹرک پاس کرنے کے بعد کمپونڈری کی ٹریننگ لے لی۔ اب پھر اکثر اماں سے ملنے وہاں جانے لگا تھا۔ انھیں باہر ہی بلوا کر ملاقات کر لیتا۔ اسی دوران میں دیکھتا' جب بھی کوئی سائل اس دروازہ پر آتا تو اندر سے بیگم صاحبہ کی بڑی نخوت بھری آواز آتی۔

''ان بھکاریوں نے تو ناک میں دم کر رکھا ہے۔ اچھا گھر دیکھ لیا ہے۔ جب دیکھو چلے آتے ہیں۔ نکمے کام چور۔ محنت مزدوری تو کرنی نہیں ہے۔ بس مفت کی روٹیاں توڑنا چاہتے ہیں۔''

وہ یہ دیکھنے کی زحمت گوارا نہ کرتیں کہ سائل بوڑھا بیمار ہے یا اپاہج۔

پھر مجھے ایک سرکاری ہسپتال میں جاب مل گئی اور اس گھر سے میرا ناطہ ہی ٹوٹ گیا۔ اور آج انھیں اس حال میں دیکھ کر بس مجھے خدا ہی یاد آ رہا تھا۔

گجرات کے انسانیت سوز فسادات نے ان کے سارے کس بل نکال دیے تھے۔ سب کچھ لوٹ لیا تھا۔ سب کچھ تہس نہس کر دیا تھا۔ نہ وہ اکڑ باقی تھی نہ غرور' نہ شان نہ شیخی۔ کہاں گیا وہ بنگلہ' کہاں گئے ایر کنڈیشنڈ روم؟ آج وہ بے سروسامانی کی حالت میں جلے کٹے انسانوں کے درمیان پڑی تھیں۔ جہاں کسی کا پرسان حال نہ تھا۔ افراتفری کا ماحول تھا۔ نہ صحیح سے دوا مل رہی تھی نہ خوراک فراہم تھی' مجھے ان پر بہت ترس آتا۔ میں نے اپنے دل سے ساری کدورت نکال ڈالی تھی۔ میں اور سب مریضوں کی بنسبت ان کی دیکھ بھال زیادہ کرتا۔ اپنے ہاتھوں سے زخم صاف کرتا مرہم پٹی کرتا۔ اور دوائیاں دیتا۔ اکثر وہ دوائیاں کھانے سے انکار کر دیتیں۔ ہذیانی کیفیت

میں چیخنا چلانا شروع کردیتیں۔

''چھوڑ دو مجھے۔نہیں کھانی مجھے دوائیاں ۔ مجھے مرجانے دو۔نہیں جینا مجھے۔''

لیکن جب وہ نارمل حالت میں رہتی تو کچھ باتیں کرلیا کرتیں ۔ ایک دن انھوں نے مجھ سے کہا۔

''تم یہ سب اتنا میرے لیے کیوں کرتے ہو میں تمہاری کیا لگتی ہوں۔آخر مجھ سے تمھارا کیا رشتہ ہے؟''

''آپ بھول رہی ہیں بیگم صاحبہ ! ہمارے درمیان ایک رشتہ ہے اور وہ ہے انسانیت کا رشتہ جو سب سے زیادہ عظیم ہے۔''

میں دیر تک سوچتا رہا کہ ایک انسان کا دوسرے انسان سے کتنا گہرا تعلق ہے اور یہ تعلق اس درد سے ہے جو خدا نے انسان کے دل میں غریب لاچار اور دکھی انسانوں کے لیے پیدا کیا ہے۔لیکن اکثر لوگ اس سے نابلد ہیں۔

شاید اسی بات کو دھیان میں رکھتے ہوئے شاعر نے کہا ہوگا:

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو

کچھ دیر بعد انھوں نے پھر کہا۔

''تم ہی بتاؤ میں زندہ رہ کر کیا کروں گی؟ دنیا میں اب میرے لیے کیا بچا ہے؟ کیا چھوڑا ان درندوں نے؟ سب کچھ نذر آتش کردیا۔متاع عزیز بھی چھن گئی۔ جو باقی بچ گئے ہیں ان کے انتظار کے لیے میرے پاس وقت بہت کم ہیں۔ بے سکونی بڑھتی جارہی ہے۔اب موت ہی مجھے سکون بخش سکتی ہے۔''

''ایسی مایوسی کی باتیں نہ کریں ۔ بیگم صاحبہ۔ خدا نے چاہا تو آپ اپنے عزیزوں سے ضرور ملیں گی اور پھر میں ہوں نا' اگر آپ مجھے اس لائق سمجھیں۔''

لیکن وہ اپنی زندگی سے مایوس اور بیزار ہوچکی تھیں اور دن رات اپنی

موت کی دعائیں مانگتی رہتی تھیں۔ یوں تو کسی کے دل کے آبگینے کو چکنا چور کرنے کی کوئی تلافی ممکن نہیں۔ لیکن وہ اب تک اپنے کیے کی کافی سزا پا چکی تھیں اس لیے ان کی دعائیں بارگاہ ایزدی میں قبول ہو گئیں۔ اور انھیں اس اذیت ناک زندگی سے چھٹکارا مل گیا۔

اور میں دیکھتا رہ گیا دنیا کی بے ثباتی کا تماشہ۔

☆☆☆

علی میاں کی بلی

علی میاں نے نہ جانے کہیں میگزین یا ٹی۔وی میں پرشین بلی کی تصویر دیکھ لی تھی۔پھر کیا تھا بس اسے حاصل کرنے کے لیے ان کا دل مچل اٹھا۔اگر دل مچلتا تو کوئی بات نہ تھی۔یہ بھوت تو سر پر ہی سوار ہوگیا۔اب سوال یہ تھا کہ اسے خریدنے کے لیے کسے پٹایا جائے کیونکہ وہ کوئی معمولی بلی نہ تھی۔کئی دنوں کے سوچ بچار کے بعد انھیں بڑے ابو ہی اس کے لیے مناسب لگے کیونکہ وہ ان کے لاڈلے اور چہیتے تھے۔آخر ایک دن بڑے ابو کی دگود میں اچھل کود کرتے ہوئے انھوں نے اپنا مدعا بیان کر ہی دیا۔حالانکہ انھیں فضول خرچی بالکل پسند نہ تھی پھر بھی اپنے لاڈلے کی خواہش پوری کرنے کے لیے بلی کی تلاش میں نکل پڑے۔لیکن تلاش بسیار کے باوجود کہیں مطلوبہ بلی نظر نہ آئی۔لہٰذا چند کھلونے دے کر انھیں بہلانے کی کوشش کی گئی۔لیکن کھلونوں سے وہ خاک بہلتے ان کے سر پر تو بلی کا بھوت سوار تھا۔

پھر گرمی کی چھٹی میں جب وہ اپنے نانا ابو کے یہاں آئے تو آتے ہی بلی خرید

نے کی دھوم مچادی۔ نانا ابو بیچارے تو اس پوزیشن میں نہ تھے مگر ماموں جان جو مڈل ایسٹ میں رہتے تھے اور ان دنوں آئے ہوئے تھے، وہی ان کی آرزو پوری کر سکتے تھے لیکن اب سوال نانی اماں کا تھا جنھیں جانوروں سے سخت الرجی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر کسی کو کوئی فکر، کوئی غم اور پریشانی نہ ہو تو وہ جانور پال لے۔ لیکن نانی کے لیے نواسہ ایسی پیاری شے ہے کہ اگر بس میں ہو تو اس کے لیے چاند تارے بھی توڑ کر لائے جاسکتے ہیں، اور نانی اماں کا دل ڈول گیا۔ پھر ان کی طرف سے سگنل ملتے ہی بلی کی تلاش شروع ہوگئی لیکن بلّی کہیں دستیاب نہ ہوسکی۔ لاچار ولایتی چوہے کا ایک بچہ خرید لیا گیا۔ اب علی میاں کو وہ پسند آیا کہ نہیں لیکن نانی اماں کو وہ بیحد پسند آگیا۔ بالکل علی کی طرح گول مٹول سفید براق۔ اس کی حرکتیں بھی بڑی پیاری تھیں۔ جب اسے بھوک لگتی تو چوں چوں کر کے پورے گھر کو سر پر اٹھالیتا اور جب پیٹ بھر جاتا تو کلیل کرتا رہتا۔ علی میاں کا بھی یہی حال تھا۔ جب ان کی ٹنکی فل ہوجاتی تو بڑے ترنگ میں بڑی پیاری پیاری میٹھی دلچسپ باتوں سے سب کا دل موہتے رہتے۔ بہر کیف وہ جب تک وہاں رہے چوہے کے بچے کے ساتھ خوب کھیلے کودے۔ جب واپس جانے لگے تو اسے وہیں چھوڑ دیا۔ نانی اماں نے کہا، چلو ٹھیک ہے۔ یہ علی کی یاد دلاتا رہے گا۔ مگر اللہ کی پناہ جوں جوں وہ بڑا ہوتا گیا اس کی شرارتیں بھی بڑھتی گئیں۔ بچہ چاہے انسان کا ہو یا حیوان کا جب تک وہ بچہ رہتا ہے معصوم اور بے ضرر رہتا ہے لیکن بڑا ہو کر شرارتوں کا پٹارہ بن جاتا ہے۔ وہ بھی شرارت کا پتلا بن چکا تھا۔ کبھی کپڑا کترتا تو کبھی جوتا۔ آلو پیاز کاٹ کاٹ کر تو اس نے نانی اماں کی ناک میں دم کر رکھا تھا۔ اب اس بلا سے وہ تنگ آچکی تھیں اور جب تک اس سے چھٹکارا حاصل نہیں کیا چین کی سانس نہ لی۔

اس بات کو کئی ماہ گذر چکے تھے لیکن علی میاں کے سر سے ابھی تک بلی کا بھوت نہیں اترا تھا۔ دیوالی کی تعطیل میں جب وہ اپنے ابوامی کے ساتھ بمبئی گھومنے گئے تو آخر

ان کی مراد پوری ہو ہی گئی۔ ایک پرشین بلی خرید لی گئی جس کی قیمت دس ہزار تھی۔ جب نانی اماں کو یہ خبر ملی تو وہ سینے پر ہاتھ رکھے منہ کھولے چند لمحے سکتہ کی سی کیفیت میں رہیں۔ پھر ناراضگی کا اظہار کرتی ہوئی بولیں۔ امیروں کے چونچلے بھی عجیب ہیں۔ دس ہزار۔ دس ہزار کوئی معمولی رقم نہیں ہوتی۔ اتنی رقم میں تو کسی غریب کا بھلا ہو جاتا لیکن پیسہ والے کیا جانیں اس کی اہمیت۔ پیسہ کی قدر و قیمت تو وہ جانتا ہے جس کا مستقبل اس کی کمی سے تاریک ہو چکا ہے۔ موقع بے موقع پیسے کے حصول کے لیے جسے ذہنی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا ہو۔ قدم قدم پر جس کی انا مجروح ہوئی ہو۔ ان کا ذہن یکلخت بہت پیچھے کی طرف چلا گیا۔ ان کے آباؤ اجداد کو اس قسم کے شوق نے تباہ کر ڈالا تھا۔ ان ہی شوقوں نے موضع نگل ڈالا تھا۔ اگر ان کی اولاد تعلیم کا سہارا نہ لیتی تو آج کھیتوں کھلیانوں میں اتر چکی ہوتی۔ انہوں نے ایک سرد سانس لی۔

اب علی میاں اور ان کی امی کا جب بھی فون آتا تو بلی کا ذکر اور اس کی خیر خیریت ضرور سنائی جاتی۔ ایک دن علی میاں نے بہت لہک کر کہا۔

"نانی اماں وہ دودھ انڈا اور بسکٹ کے علاوہ کچھ نہیں کھاتی ہے۔"

نانی اماں کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ پھر سرد آہ بھر کر بولیں۔

"ہے ہے! ہمارے پڑوس کے غریب بچے بیچارے ایک سوکھی روٹی کے لیے ترس رہے ہیں اور اس نگوڑی بلی کے نصیب تو دیکھو۔"

ایک غیر مسلم پڑوسن کہیں سے آدھمکی۔ وہ کہنے لگی۔

"اس بلی نے ضرور پچھلے جنم میں کوئی پُن کا کام کیا ہوگا۔"

نانی اماں نے دونوں کان چھو کر توبہ کرتے ہوئے کہا۔

"پن اور پاپ کا حال تو خدا ہی بہتر جانتا ہے میں تو صرف اتنا جانتی ہوں کہ وتعز من تشآء وتذل من تشآء ۔ وہ جسے چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے

ذلت دیتا ہے۔"

پھر ہوا یوں کہ اگلی چھٹی میں جب علی میاں اپنی امی ابو کے شامل آنے والے تھے تو اطلاع دی کہ بلی بھی ان کے ساتھ آ رہی ہے۔ یہ سنتے ہی نانی اماں کے تو اوسان ہی خطا ہو گئے۔

"بھلا میں کہاں سے اتنے ناز نخرے اٹھاؤں گی۔"

لیکن منع تو کر نہیں سکتی تھیں کہ علی میاں کا دل ٹوٹ جاتا۔

پھر خیر سے جب وہ مع بلی کے پہنچے تو نہ صاحب نہ سلامت' سب کے سب اس نگوڑی بلی میں لگ گئے۔ ٹھنڈا پانی گرم اور گرم پانی ٹھنڈا ہونے لگا۔ جھٹ پٹ کھڑکی دروازہ بند کیا جا رہا تھا کہ معاً وہ کھڑکی سے کود ہی نہ جائے۔ کیونکہ وہ اجنبی اور گھبرائی نظروں سے ادھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔

اور اب یہ ایک دن کا سوال نہ تھا۔ روز کا معمول بن گیا تھا۔ نانی اماں بیچاری کی جان آفت میں تھی۔ پورے گھر میں بولائی بولائی پھرتیں۔ کبھی کھڑکی بند کرتیں تو کبھی دروازہ۔ کس کس کو دروازہ کھلا نہ چھوڑنے کی تاکید کرتیں۔ آنے جانے والوں کا تو تانتا بندھا ہوا تھا۔ بلی نہ آئی تھی گویا تماشا آ گیا تھا۔

بچے تو بچے بڑے بھی اسے دیکھنے کے لیے ٹوٹے پڑ رہے تھے اور ہدایت یہ تھی کہ زیادہ لوگ اس کے آس پاس نہ رہیں ورنہ اسے انفکشن لگ جانے کا خدشہ ہے یعنی انسانوں سے زیادہ جانور کی جان کو خطرہ لاحق ہے۔ شروع سے یہی سنتے آئے تھے کہ:

"بچو! بلی کتے کے پاس نہ جاؤ اس کی سنگت صحت کے لیے مضر ہے۔ اس کی رال اور سانس سے کئی قسم کی خطرناک بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔"

ایک دن جو شامت آئی تو کسی نے شیمپو سے اسے غسل دلوا دیا۔ پھر بس تہلکہ مچ گیا کہ اب تو اس کے سارے روئیں ہی جھڑ جائیں گے۔ اس کے لیے تو کوئی خاص

قسم کا شیمپو استعمال کیا جاتا ہے۔ نانی اماں بیچاری چوری بنی دل ہی دل میں عافیت کی دعا مانگ رہی تھیں۔

وہ حیران و پریشان تھیں۔ کچھ بھی ہوتھی تو وہ جانور ہی۔ گدے پر سوئے یا پالنے میں جھولے گدا پالنا چھوڑ کونے کھدرے میں ایسی چھپی کہ تلاش کرنا محال ہو جاتا' باہر جانے کی کوشش میں کبھی ریلنگ پر چڑھ جاتی۔ کبھی دروازے سے باہر نکل بھاگنے کی کوشش کرتی۔ اور نانی اماں کا دل دھک دھک کرنے لگتا کہ کہیں یہ غائب ہی نہ ہو جائے۔ کیونکہ علی میاں تو علی میاں اب تو ان کے ابو امی کی جان بھی اس میں اٹکی تھی۔

پھر ایک دن ہنگامہ ہوا کہ بلی غائب ہے۔ پورے گھر میں تلاش کیا گیا۔ کونے کھدر میں جھانکا گیا۔ اڑوس پڑوس' ادھر اُدھر' نیچے اوپر' نانی اماں بجلی بنی ہوئی تھیں۔ پھر تھک ہار کر بیٹھ گئیں۔ ہاتھ پاؤں کانپنے لگے۔ جسم سے گھڑوں پسینہ نکلنے لگا۔ سارے لوگ بلی کو بھول بھال کر ان کے گرد جمع ہو گئے۔ سب پریشان تھے کہ یہ کیا ہو گیا۔ کوئی پانی پلا رہا تھا' کوئی پنکھا جھل رہا تھا' کوئی تیل مالش کر رہا تھا۔ علی میاں ہکا بکا کھڑے تھے۔ ان کی امی کا رو رو کر برا حال تھا۔

''امی! آنکھیں کھولیے ایسی ایسی ہزار بلیاں آپ پر قربان۔''

لیکن انھیں نہ آنکھیں کھولنی تھی نہ کھولیں۔ پھر لا دلود کر انھیں ادھر ہاسپٹل لے جایا جا رہا تھا اُدھر شور ہوا کہ بلی مل گئی' بلی مل گئی۔

لیکن اب بلی کی کسے پرواہ تھی اب تو نانی اماں کے جان کے لالے پڑے تھے۔

☆☆☆
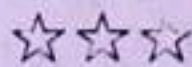
لالی

دلہن جب سے آئی تھی بالکل خاموش تھی ۔ چہرے پر اداسی اور آنکھوں میں ویرانی چھائی ہوئی تھی جب کہ ظفر میاں کا خیال تھا کہ اس کے قدم زمین پر نہ ٹکیں گے ۔ وہ زمین اور آسمان کے بیچ معلق جھولتی رہے گی ۔ یہ بات بعید از قیاس بھی نہ تھی کیونکہ دونوں کی حیثیت میں آسمان وزمین کا فرق تھا ۔ وہ تو گودڑ سے لال نکال لائے تھے ۔ نہ جانے انھوں نے اسے کہاں دیکھا تھا کہ بس فدا ہی ہو گئے ۔ اور جب تک اسے حاصل نہ کرلیا چین کی سانس نہ لی ۔

لیکن یہ کیا ؟ وہ تو اپنی قسمت پر نازاں ہونے کی بجائے مرجھائی رہتی ۔ جب کھانے کے لیے بیٹھتی تو ایک لقمہ کھا کر ہی اُٹھ جاتی ۔ ایک دن ساس نے پوچھا ۔

’’ کیوں دلہن کھانا پسند نہیں آیا ؟ ‘‘

’’ پسند ؟ ‘‘ پسند اور ناپسند کیا ہے یہ تو آج تک اس نے جانا ہی نہیں ۔ روکھا سوکھا جو کچھ ملتا پلاؤ قورمہ سمجھ کر کھاتی رہی ہے ۔ لیکن اب نہ جانے یہ لقمہ حلق میں کیوں اٹکتا ہے ۔ یہ سب سوچتے ہوئے وہ ساس کی طرف دیکھتی جا رہی تھی ۔ چہرے پر کچھ تلاش

کر رہی تھی۔ وہاں تو سب کچھ تھا۔ پیار' محبت' خلوص اور ممتا۔ پھر یہ تشنگی کیسی؟

ان دونوں کے اسٹیٹس میں جتنا زیادہ فاصلہ تھا' گھروں کا فاصلہ اتنا ہی کم تھا۔ صبح اٹھتے ہی وہ چھت پر چلی جاتی اور گھنٹوں نہ جانے کیا دیکھتی رہتی۔ یہ بات ظفر سے پوشیدہ نہ رہ سکی۔ وہ بھی دبے قدموں اس کے پیچھے چلے جاتے اور چھپ کر دیکھتے رہتے لیکن کوئی بات قابل گرفت نہ پاتے سوائے اس کے کہ وہ اپنی انگلیوں کے پوروں سے آنکھوں کے گوشوں کو صاف کرتی اور ٹھنڈی ٹھنڈی آہیں بھرتی۔ معاملہ بڑا پیچیدہ تھا۔ انھیں جستجو سی ہوگئی۔ آخر وہ کیا دیکھتی ہے۔ کسے تلاش کرتی ہے؟ شک کا ناگ پھن اٹھانے لگا۔

''بچو! یہ نہ سمجھنا کہ میں بے خبر ہوں۔ میرے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ میں سب کچھ پتہ لگا کر ہی دم لوں گا۔''

جب وہ میکے جاتی تو ہفتوں گذار آتی۔ ظفر پوچھتے۔

''وہاں کیا ایسا ہے کہ تم سب کچھ بھلا بیٹھتی ہو؟''

''یہ پوچھئے کہ وہاں کیا نہیں ہے۔'' وہ مسکرا کر کہتی۔ اور وہ سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھتے رہ جاتے۔

''ایک بات پوچھوں لالی؟'' جب وہ بڑے موڈ میں ہوتے تو پوچھتے۔

نام تو اس کا کچھ اور تھا لیکن وہ اتنی سرخ و سفید تھی کہ ماں باپ اسے لالی کہتے تھے۔

''پوچھئے۔''

''کیا تم نے کسی سے کبھی عشق کیا ہے؟''

''کیوں نہیں۔''

''وہ کون ہے؟''

''یہ جاننا کیا ضروری ہے؟ میں کیوں اپنا راز بتاؤں؟''

''یہ راز تو میں جان ہی جاؤں گا تم بچ کر کہاں جاؤ گی'' وہ دل ہی دل میں کہتے۔

دن یونہی گذر رہے تھے۔ ان کی محبت ان کے جذبوں کو کوئی پذیرائی نہ ملی تھی۔ وہ تو برف کا تودا تھی۔ ٹھنڈی یخ بستہ۔ نہ کوئی حرارت نہ کوئی گرم جوشی۔ وہ ہنوز تشنہ تھے۔ مرجھائے مرجھائے خاموش رہتے۔

ایک دن انھیں کچھ زیادہ ہی خاموش دیکھ کر لالی نے پوچھا۔

''کیا آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں؟''

''تمھیں میری طبیعت کی کب سے فکر ہونے لگی؟ تمھیں اپنی گمشدہ محبت کی تلاش سے کب فرصت ہے جی؟''

وہ کچھ نہ سمجھ سکی۔ ایسے کڑوے رویہ کی وہ کب عادی تھی۔ غریب ضرور تھی لیکن خوشیوں کے گہوارے میں پلی بڑھی تھی۔ آنکھوں کے سامنے سارے مناظر گھوم گئے۔

ایک روم کا کوارٹر..... سامنے چھوٹا سا صحن' جہاں وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ چھپا چھپی کھیلتی۔ وہ بھی کتنے مزے کے دن تھے۔ یاد کر کے اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

چھوٹے بڑے سب بھائی بہن صبح اٹھتے' رات کی بچی روٹی چائے کے ساتھ کھا کر اپنا اپنا بستہ سنبھالتے اور اسکول کی طرف کا رخ کرتے۔ ابا کارخانے کی طرف چل پڑتے۔ اگر گھر میں کچھ رہتا تو اماں چولہا جلا لیتیں ورنہ خاموش بیٹھی رہتی یا پڑوسن سے گپیں مارتیں۔ اسکول سے واپس آکر ہم لوگ ابا کا شدت سے انتظار کرتے۔ پانچ بجے ابا آتے۔ چھوٹے چھوٹے ٹھونگے جھولے میں لیے ہوئے۔ اماں چولہا جلاتیں۔ ہم سب اپنی بھوک دبانے کے لیے زور زور سے اپنا سبق یاد کرتے۔ پھر کھانا کھا کر نیند کی آغوش میں پہنچ جاتے۔ جب پیٹ بھر جاتا ہے تو نیند بھی خوب آتی ہے۔ کسی کو کچھ ہوش نہیں رہتا تھا۔ کسی کی ٹانگ کسی کے منہ پر کوئی' کسی کے پیٹ پر اوندھ جاتا' کوئی قیں قیں کرتا۔ کوئی اٹھ کر رونا شروع کر دیتا۔ اماں کو غصہ آتا تو دو دھول جما دیتیں۔ اسی طرح صبح سے شام اور شام سے صبح ہوتی رہتی۔ دیر تک وہ اپنے گذرے دنوں کو یاد کرتی رہی۔

ادھر جوں جوں وقت گذرتا جا رہا تھا' ظفر کی بے چینیاں بڑھتی جا رہی تھیں۔

پتہ لگا لگا کر ہار گئے تھے۔ کوئی سرا ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔ سوچتے 'بڑی گھاگ ہے' کچھ بولتی ہی نہیں۔ بھنک لگنے نہیں دے رہی ہے۔ بات تو اتنی معصومیت سے کرتی ہے جیسے دودھ کی دھلی ہو۔ لیکن آج نہیں تو کل میں سب کچھ پتہ لگا کر ہی رہوں گا۔

''یار احمد! میرا ایک کام کر دے گا؟'' ایک دن یونہی گفتگو کے دوران ظفر نے کہا۔

''بتا کیا کام ہے؟''

''یہ پتہ لگانا ہے کہ میرے سسرال کے اڑوس پڑوس میں کون کون رہتا ہے۔''

''کیوں کیا بات ہے؟''

''ہے کچھ بات..... بعد میں بتاؤں گا۔ پہلے تم میرا یہ کام کر دو۔''

''کس قسم کی فیملی کے بارے میں پتہ لگانا ہے؟''

کوئی ایسی فیملی جس میں کوئی جوان لڑکا ہو۔''

''کیا شادی وادی کا معاملہ ہے؟''

''ایسا ہی سمجھ لو۔'' احمد کچھ دیر سوچتا رہا' پھر بولا۔

''آں..... ہاں' یاد آیا ایک فیملی کو تو میں جانتا ہوں۔ ان کا لڑکا گلریز میرا کلاس فیلو تھا۔''

''اس کی شادی ہو چکی ہے؟''

''ارے نہیں یار ابھی تو پڑھ ہی رہا ہے۔ لیکن تو یہ سب کیوں پوچھ رہا ہے۔ معاملہ کیا ہے؟ کس کے لیے منسوب تلاش کر رہا ہے؟''

''ہے کوئی۔''

''ہاں اگر شادی بیاہ کا معاملہ ہے تو لڑکا اے ون ہے۔ بہت ہی شریف اور ہینڈسم۔''

''ہاں۔'' ظفر نے 'ہاں' کو لمبا کھینچا..... بس اتنا ہی کافی تھا۔ ان کا شک یقین میں بدل چکا تھا۔ سب کچھ کھل کر سامنے آ گیا تھا۔ اب دیر کرنا فضول ہے۔ زیادہ کریدنے کی ضرورت نہیں۔ اس کام کو جلد ہی انجام دے دینا بہتر ہو گا۔ کل ہی وکیل کے پاس جا کر

ساری کاروائی مکمل کرلوں گا۔ اماں.....؟ وہ تو بہت ہی ناراض ہوں گی ۔کوئی بات نہیں۔ انھیں اعتماد میں لےلوں گا۔نہیں نہیں وہ تو طوفان ہی کھڑا کردیں گی۔ٹھیک ہے سارے کام خاموشی سے کرلیتا ہوں پھر دیکھا جائے گا۔

چند دنوں بعد جب انہوں نے لالی کوطلاق نامہ پر دستخط کرنے کے لیے کہا تو وہ کچھ نہ سمجھ سکی۔

''یہ کیا ہے؟'' اس نے حیرت سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''اس پر دستخط کرو۔اب ہمارے تمہارے راستے الگ الگ ہوں گے۔''

''لیکن کیوں۔میرا قصور کیا ہے؟''

''یہ نہ پوچھو کہ قصور کیا ہے؟تم ایک مجرم ہو قاتل ہو۔تم نے میری محبت میرے خلوص اور میرے جذبوں کا قتل کیا ہے۔جاؤ اب تمھیں اپنے عاشق کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے گھنٹوں انتظار کرنا نہیں پڑے گا۔''

''یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ کیسا عاشق اور کیسا معشوق؟''لالی حیرانی سے پوچھ بیٹھی۔

''تمھارا پرانا عاشق گلریز.....جس کے دیدار کے لیے تم روز چھت پر جاتی ہو۔''

''گلریز تو میرے چھوٹے بھائی کی طرح ہے۔ میں تو چھت پر صرف ابا کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے جاتی تھی۔ وہ صبح روزانہ اسی راستہ سے گذرتے ہیں۔ میں ان کے چہرے پر اطمینان کی جھلک تلاش کرتی تھی۔ کیونکہ چشم تصور میں میں ہمیشہ ان کا فکر میں گھرا ،پریشان اور مرجھایا ہوا چہرہ دیکھتی رہتی تھی۔

''اور وہ عشق والی بات؟''

''تو کیا میں آپ سے عشق نہیں کرتی؟''

''سچ''؟ ظفر کو ایسا لگا کہ ان کے اردگرد اجالے پھیل گئے ہوں۔

☆☆☆

تلاش

وہ ہوش وحواس سے بیگانہ ہو چکا تھا۔ بس اس کی آنکھوں کے سامنے ہر وقت وہ منظر رہتا جب ہر طرف دھویں کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ شعلوں کی اونچی اونچی لپٹیں اٹھ رہی تھیں۔ مکان کی چھتیں اور دیواریں زمیں بوس ہو رہی تھیں۔ انسانوں کی دوردناک چیخ وپکار سینے کو چھلنی کر رہی تھی۔ گوشت اور ہڈیوں کے جلنے کی چڑاند نتھنوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ انسانیت دم توڑ رہی تھی۔ وہ نہ جانے کیسے اب تک زندہ تھا۔ خود کو چھپائے اندر سے اٹھتی ہوئی چیخ کو دبائے۔ اتنا ہوش ابھی باقی تھا۔ پورا علاقہ جل کر راکھ کا ڈھیر بن چکا تھا۔ کچھ بھی باقی نہ بچا تھا پھر بھی اسے تلاش تھی سکون کی تحفظ کی۔ وہ اس تلاش میں شہر شہر جگہ جگہ سرگرداں تھا۔ اس کا حلیہ اب بھکاریوں جیسا ہو چکا تھا۔ لوگ راہ چلتے اس کے سامنے پیسے پھینک دیتے۔ وہ پکارتا۔

''سنو بھائی! مجھے پیسہ نہیں چاہئے۔ صرف سکون اور تحفظ چاہئے۔''

ایک دن چند لوگ وہاں پر جمع ہو گئے۔ کسی نے پوچھا۔

''یہ کون ہے؟''

''شاید کوئی پاگل ہے۔''

''تو اسے پاگل خانے میں ڈال دو۔''

''چھوڑ دو یونہی بھٹکتا ہوا مر جائے گا۔'' سب اپنی اپنی بولیاں بول رہے تھے۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجمع کی طرف دیکھ رہا تھا۔ حیرت زدہ تھا انسانوں کی سفا کی پر۔ اس کی نظروں کے سامنے ایک بار پھر وہ منظر آ گیا۔ جب پورا شہر جل رہا تھا۔ لوگ چلا چلا کر مدد مانگ رہے تھے' گڑگڑا رہے تھے۔ لیکن صاحب اقتدار' ملک کے رکھوالے' تحفظ کے ضامن سب کے سب بہرے اندھے اور گونگے ہو چکے تھے۔ انسانیت مر چکی تھی درندوں کی بہتات تھی۔ جو ہر وقت چیرنے پھاڑنے کے لیے تیار تھے۔

وہ ظلم وستم کی اس دنیا کی حدود سے نکل جانا چاہتا تھا۔ لیکن کہاں؟ وہ سر جھکائے اسٹیشن کی طرف چل پڑا۔ تبھی پکڑو پکڑو جانے نہ پائے کی صدائیں بلند ہوئیں۔ کوئی شخص اسے دھکا دیتا ہوا آگے نکل گیا۔ کچھ لوگ اس کے اِرد گرد جمع ہو گئے۔

''یہی جیب کترا ہے۔'' کسی نے بلند آواز میں کہا۔ اس کے پاکٹ میں پڑا ہوا بٹوا اس بات کی تصدیق کر رہا تھا۔ ایک بار پھر مارو مارو کی صدائیں بلند ہوئیں وہ ایک ایک کے سامنے ہاتھ جوڑ رہا تھا۔

''نہیں بھائی میں چور نہیں ہوں مجھے پیسہ نہیں چاہیے۔ میں تو سکون اور تحفظ کی تلاش میں ہوں۔''

لیکن کسی نے اس کی ایک نہ سنی وہ بری طرح پٹ رہا تھا۔ پھر لوگوں نے اسے حوالات میں ڈال دیا۔ وہ تصویر حیرت بنا سوچ رہا تھا کہ اس ناکردہ گناہ کی سزا اسے کیوں دی جا رہی ہے؟ لیکن اس کیوں کا جواب کسی کے پاس نہ تھا۔

تین ماہ کی سزا کاٹ کر جب وہ باہر آیا تو بے حد دل برداشتہ تھا۔ کہیں اسے

سکون نصیب نہ تھا۔

ایک دن وہ یونہی انٹرنیٹ کیفے کے پاس کھڑا تھا۔اچانک پولس نے چھاپہ مارا اور دکان کی ساری چیزیں اٹھا کر لے گئی۔اس کے مالک کو بھی پکڑ لیا۔کئی لوگ وہاں پہنچ کر معاملہ کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کر رہے تھے ان ہی میں سے ایک شخص نے کہا۔

''کوئی تخریب کار اپنے گروہ کو خفیہ پیغام بھیجتا تھا۔اسی پوچھ تاچھ کے لیے پولس اسے پکڑ کر لے گئی ہے۔ایک نے کہا۔

''یہ تو بڑی ہی زیادتی کی بات ہے۔دن میں سیکڑوں آدمی آتے ہیں' ہر ایک کی بات چیت کا ریکارڈ رکھنا تو بہت مشکل ہے۔بے چارہ بہت ہی غریب ہے۔ماں بیوہ ہے' بڑی ہی جدوجہد سے یہ بزنس شروع کیا تھا۔اور کوئی ذریعہ معاش بھی نہیں ہے۔

وہ کھڑا سب کچھ سن رہا تھا اور منہ ہی منہ میں بڑبڑا رہا تھا۔

''کہاں جاؤں کہاں تلاش کروں۔ہر سو عدم تحفظ کا عفریت منہ کھولے کھڑا ہے۔''

پریشان بھٹکتا ہوا وہ ایک جگہ پہنچا۔ایک جگہ ایک بڑا ہجوم تھا۔شاید کوئی ہڑتال تھی۔ایک بڑی عمارت پر لوگ پتھراؤ کر رہے تھے۔کسی کا پتلا جلا رہے تھے۔نعرے لگا رہے تھے۔پولس آ گئی۔پہلے آنسو گیس چھوڑے گئے' لیکن کوئی ٹس سے مس نہ ہوا۔ پھر فائرنگ شروع ہو گئی۔بھگدڑ مچ گئی۔لوگ تتر بتر ہونے لگے۔تبھی ایک گولی اس کے سینے میں آ کر لگی۔وہ تڑاخ کی آواز کے ساتھ زمین پر گر گیا۔سینے سے خون کا فوارہ ابل پڑا۔آنکھیں پھٹ کر آسمان کی طرف لگ گئیں۔جیسے وہ خدا سے شکوہ کر رہا ہو۔

''اے خدا تیری اتنی بڑی دنیا میں کہیں بھی تحفظ نہیں۔تو تو سب سے بڑا محافظ سب سے بڑا نگہبان' سب سے بڑا مہربان ہے۔پھر یہ کس خطا' کس نافرنی کی سزا تو اپنے بندوں کو دے رہا ہے؟''

☆☆☆

تلاش

جائے پناہ کہیں نہیں

"بھائی صاحب آپ کہاں جا رہے ہیں؟"

"جہنم میں۔"

"وہ کیسی جگہ ہے؟"

"پتہ نہیں؟ اس دنیا سے تو بہتر ہی ہوگی۔"

"تو مجھے بھی اپنے ساتھ لیتے چلیے۔"

"کیوں تمھیں یہاں کیا دکھ ہے؟"

"ایک دکھ ہو تو بتاؤں، یہاں تو دکھوں کا انبار ہے۔ گردن سولی پر لٹکی ہے۔ پیچھے مڑ کر دیکھوں تو پھندا تیار ہے۔ ہر طرف آگ کی لپٹیں ہیں۔ زندگی بم پستول اور گولی بارود کی زد میں ہے۔ کہیں جائے پناہ نہیں۔ برائے مہربانی مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلیے۔"

"ٹھہرو۔ ابھی مجھے جانے دو۔ جہنم کے داروغہ سے اجازت بھی لینی پڑے گی۔"

"بھائی صاحب اس کے لیے رشوت تو نہیں دینی پڑے گی۔"

''یہاں تو رشوت کے لین دین سے میں تنگ آچکا ہوں۔ رشوت دینے کے لیے جیب میں ہر وقت پیسہ رہنا ضروری ہے۔ پیدا ہونے سے لے کر مرنے تک قدم قدم پر رشوت دینی پڑتی ہے۔ اسکول میں بچوں کا داخلہ کرانے کے لیے رشوت۔ اگر اچھے نمبروں سے امتحان پاس کرانا ہے تو بھی رشوت۔ میڈیکل سرٹیفکٹ بنوانا ہو یا راشن کارڈ..... بغیر رشوت کے کام نہیں بنتا۔ ڈاکٹروں کے یہاں لائن لگانے میں رشوت۔ سرکاری تو سرکاری پرائیوٹ اسپتالوں اور نرسنگ ہوم میں بھی بغیر رشوت دیے چین نہیں۔ عدالت کے کٹہرے میں کھڑے مجرموں کو بیگناہ ثابت کرنے کے لیے رشوت' کسی چیز کی خرید وفروغت کے لیے بھی رشوت..... غرض آگے رشوت پیچھے رشوت اوپر رشوت نیچے رشوت' یہاں تک کہ مرنے کے بعد بھی چین نہیں۔ دو گز زمین حاصل کرنے کے لیے بھی کبھی کبھی رشوت دینی پڑتی ہے۔''

''ارے بھائی صاحب آپ کہاں چل دیے' میری پوری بات تو سن لیجیے۔ ابھی تو مجھے بہت کچھ کہنا ہے۔ یہاں یہی مشکل ہے کوئی کسی کی سنتا ہی نہیں۔''

''مجھے نہیں سننی تمہاری باتیں۔ یہ سب دیکھتے دیکھتے آنکھیں پتھرا گئیں ہیں اور سنتے سنتے کان پک گئے ہیں۔ اب مجھے اس جہنم کو جلد از جلد خیر باد کہنا ہے۔''

''ٹھیک ہے بھائی صاحب! جائیے ضرور جائیے۔ لیکن میری سفارش کرنا نہ بھولیے گا۔''

☆☆☆

نقار خانہ

''اللہ کے نام پر دے دے بابا!''

''بچوں کا صدقہ دے دے بابا!''

''تیرا بھلا ہو ایک ڈالر دے دے بابا!''

حاجی علی کے روضہ کی طرف جاتے ہوئے یہ صدائیں مسلسل میرا پیچھا کر رہی تھیں۔ میں پیالہ میں پانچ کا سکہ ڈال کر آگے بڑھ گیا۔ روضہ جانے والے راستے کے دونوں طرف قطار سے بیٹھے ہوئے ان لوگوں کی تعداد تقریباً پچیس تیس ہوگی اور ظاہر ہے کہ میں ہر ایک کے پیالہ میں پانچ کا سکہ تو نہیں ڈال سکتا تھا۔

''یہ کیا دے گا یہ تو خود ہی فقیر ہے بیچارہ ہندوستانی۔'' یہ آواز گولی کی طرح میری سماعت کے پردے پر لگی اور برچھی کی طرح میرے دل میں پیوست ہوگئی۔ بیچارہ ہندوستان .....جس کی شان کے قصے تواریخ میں موجود ہیں۔ شاعر نے جس کی شان میں قصیدے لکھے۔ جہاں اولیاء نے اپنی کرامات دکھائیں۔ جہاں کوئی غریب نہ تھا۔ ہر ایک قناعت کی دولت

سے مالا مال تھا۔تب زندگی کی رفتار اتنی تیز نہ تھی اور اب تو یہ حال ہے کہ ہر شخص ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانے کی دوڑ میں لہولہان ہو رہا ہے۔چھینا جھپٹی میں خون کی ندیاں بہا رہا ہے۔ ہر طرف ظلم وستم کا بازار گرم ہے۔اگر لوگوں میں ذرا بھی عقل ہوتی تو یہ نوبت نہ آتی۔بیچارہ ہندوستان.....لیکن اس کا ذمہ دار کون ہے؟خود یہی لوگ اگر یہ آپس کی نفرت کو مٹا کر یکجہتی کے ساتھ ملک کی فلاح و بہبود کے لیے جٹ جاتے تو آج نہ تو ہندوستان بیچارہ ہوتا نہ ہندوستانی۔لیکن لوگوں کا ضمیر تو مردہ ہو چکا ہے۔جانے اس ملک کا کیا حشر ہونے والا ہے۔

اے بزرگان دین ودنیا اٹھو جاگو دیکھو تمہاری اس پاک سرزمین پر یہ کیا کیا ہو رہا ہے کوئی معجزہ تو دکھاؤ۔

جب باہر آیا تو دیکھا دو بھکاری زمین کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے کے لیے اس طرح لڑ رہے تھے جیسے دو کتے آپس میں چھیچھڑے کے لیے لڑتے ہیں۔

''ابے سالے!یہاں پر سے اپنا قبضہ ہٹا ورنہ۔''

''کیا یہ تیرے باپ کی جاگیر ہے؟''

''ہاں میرے باپ کی جاگیر ہے اور یہ جگہ میں نے اپنی بیٹی کو جہیز میں دی ہے۔کل سے میرا داماد یہاں پر اڈہ جمائے گا اور ڈالر کمائے گا۔''

''ڈالر کمانے کی ایسی کی تیسی۔دیکھتا ہوں کیسے اڈہ جماتا ہے۔''

پھر دونوں میں ہاتھا پائی شروع ہوگئی۔ میں حیرت سے کھڑا ان دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ دل میں آرہا تھا کہ کہہ دوں کہ ارے نادانو!کیوں جھگڑتے ہو؟جھگڑا بھی کسی مسئلہ کا حل ہے؟ جو چیز تمہاری ہے اسے تو سنبھال کر رکھو۔کہیں تم دونوں کے جھگڑے میں کوئی تیسرا طاقتور آکر اس جگہ کو بھی نہ ہڑپ کر جائے جس جگہ پر کھڑے ہو کر تم غرور سے سینہ تان کر لڑ رہے ہو۔

لیکن میں خاموش رہا کہ نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے؟

☆☆☆
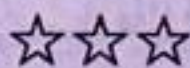
منزل

وہ چلتا رہا' چلتا رہا۔ لیکن منزل کا کہیں پتہ نہ تھا۔ شاید وہ راستہ بھٹک گیا تھا۔ جنگلوں سے گھرا ہوا وہ ایک پر پیچ اور پر خطر راستہ تھا۔ ایک طرف اونچے پہاڑ اور دوسری طرف گہری کھائی تھی' بیچ میں پتلا سا ناہموار راستہ تھا۔ دل دھڑک رہا تھا۔ وہ سنبھل سنبھل کر قدم رکھ رہا تھا۔ پاؤں کی ذراسی لغزش اسے گہری کھائی میں گرا سکتی تھی۔ بڑی مشکل سے اس نے یہ راستہ طے کیا اور اب ہموار سطح پر آگیا تھا۔ لیکن ہر طرف اندھیرا پھیلتا جا رہا تھا۔ دراصل وہ ایک گھنے جنگل میں داخل ہو گیا تھا جہاں حشرات الارض کی بہتات تھی۔ رینگنے والے' پھدکنے والے' اچھلنے کودنے والے' اڑنے والے اور چنگھاڑنے والے جانوروں کا راج تھا۔ ہر سو تاریکی چھائی ہوئی تھی کچھ بجھائی نہیں دے رہا تھا۔ ذراسی آہٹ پر خوف و دہشت سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔ نہ جانے کتنی دیر تک وہ اس جنگل کا چکر کاٹتا رہا۔ یہاں تک کہ پاؤں شل اور جسم بے جان ہو گیا۔ یا اللہ یہ میں کہاں آپہنچا؟ اب وہ غش کھا کر گرنے والا ہی تھا کہ اسے ہلکی سی روشنی دکھائی دی۔

شاید وہ جنگل سے باہر آ گیا تھا۔ وقت کا اندازہ لگانا دشوار تھا۔ نہ جانے صبح ہو رہی تھی یا شام۔ وہ آگے بڑھ گیا۔ کچھ دوری پر اسے آبادی نظر آئی۔ ہینڈ پائپ سے لوگ پانی بھر رہے تھے۔ اس کا حلق کانٹے کی طرح خشک ہو رہا تھا۔ بڑی مشکل سے اسے دو گھونٹ پانی ملا جس سے اس نے اپنا حلق تر کیا۔ سامنے بہت سارے لوگ گھیرا ڈالے کھڑے تھے۔ بیچ میں مداری ایک ہاتھ سے اپنے سدھائے ہوئے جانور کی رسی تھامے دوسرے ہاتھ سے ڈگڈگی بجا بجا کر لوگوں کو اپنی جانب متوجہ کر رہا تھا۔

"ہاں تو قدر دان، مہربان، آیئے آیئے، تماشہ دیکھئے اور دل بہلایئے۔ جمورے! اٹھ بابو لوگوں کو سلام کر۔"

جمورے اٹھا اور اس نے ادب سے تماش بینوں کو سلام کیا۔ پھر ایک ہاتھ سے بابو لوگوں کی قمیص تھامتا اور دوسرے ہاتھ سے پیٹ بجا بجا کر اپنے بھوکے ہونے کا اظہار کرتا۔ اسی وقت ایک شخص مجمع میں سے کسی کا جیب کاٹ کر بھاگ رہا تھا، لیکن رنگے ہاتھوں پکڑا گیا۔ پوچھ تاچھ پر اس نے بتایا کہ وہ مداری ہی کا ساتھی ہے۔ مداری کی چالبازی پر وہ حیرت کرتا آگے بڑھ گیا۔ تھوڑے فاصلے پر ایک مکان میں آگ کا شعلہ بھڑک رہا تھا۔ اس نے گھبرا کر پوچھا۔

"یہ کیسی آگ ہے بھائی؟"

"یہ ہوس کی آگ ہے۔ ایک ساس نے جہیز نہ ملنے پر بہو کو نذر آتش کر دیا۔ وہ تاسف حیرت اور استعجاب میں ڈوبا ہوا آگے بڑھ گیا۔

اب جو منظر اس کے سامنے تھا۔ وہ بہت ہی دردناک اور ناقابل یقین تھا۔ اس نے سر کو جھٹکا دیا۔ سڑک کے ایک کنارے چند کٹی پھٹی لاشیں پڑی تھیں۔ کسی کا سر دھڑ سے الگ تھا تو کسی کے ہاتھ کٹے تھے۔ کوئی لوتھڑے کی شکل میں تھا۔ فضا میں تعفن پھیلا ہوا تھا۔ اس کا سر چکرانے لگا۔ یہ کیسا جہاں ہے؟ یا خدا تیری دنیا میں ایسا بھی ہوتا ہے۔

ان لاشوں کا کوئی پرسان حال نہیں ہے۔ خدا کے بنائے ہوئے قانون کی یہ کیسی بے حرمتی ہے؟

''آپ کسی زمانے کی باتیں کررہے ہیں صاحب۔'' ایک راہی نے گزرتے ہوئے کہا۔

''کلجگ ہے کلجگ۔ یہاں سب کچھ ہوتا ہے۔ کسے اتنی فرصت ہے۔ کوئی زندوں کو بے غرض نہیں پوچھتا۔ یہ بے چارے تو مردے ہیں۔ بھلا ان مردوں سے کیا کام۔''

''وہ شخص کیا کہہ گیا؟'' وہ غور وفکر میں آگے بڑھ گیا۔

چلتے چلتے ایک تھانہ کے پاس سے اس کا گزر ہوا۔ دیکھا' دو پولس والے ایک خوبصورت جوان لڑکے کو حراست میں لیے ہوئے ہیں۔ وہ کسی اچھے گھرانے کا فرد معلوم ہورہا تھا۔

''ایسے بھولے بھالے لڑکے سے ایسا کون سا گناہ سرزد ہوگیا ہے؟''

''اس بھولی بھالی صورت پر نہ جائیے یہ ایک نمبر کا نشہ باز ہے۔ براؤن شوگر کی پڑیا اس کی جیب سے برآمد کی گئی ہے۔''

ابھی وہ اسی جگہ کھڑا تھا کہ چند پولس آفیسر ایک سفید پوش کو گھیرے میں لیے ہوئے وہاں پہنچے۔

''ارے یہ تو ایک شریف انسان لگ رہا ہے' یہ کس جرم میں پکڑا گیا؟''

''ہاں یہ کبھی باعزت اور پاورفل تھا۔ لیکن اس نے اپنی آنکھوں پر لالچ کی پٹی باندھ لی ہے۔ غریبوں کا حق مار کر اپنا محل تعمیر کرلیا ہے۔'' ان ہی میں سے ایک نے کہا۔

ایک طرف سے چند لوگ بے تحاشہ دوڑتے چلے آرہے تھے۔

''کیا ہوا بھائی آپ لوگ کیوں بے تحاشہ دوڑ رہے ہیں؟''

''ادھر نہ جانا ادھر بڑا خطرہ ہے۔''

''تو میں کہاں جاؤں کیا کروں۔ میں تو راستہ بھٹک گیا ہوں۔''

''دیکھو یہ دو راستے ہیں ۔ایک کا نام پر امن اور دوسرے کا نام پر خطر ہے۔ پرامن راستے پر چلنے والا آرام سے بغیر پریشانی کے منزل پر پہنچ جاتا ہے' اور پر خطر راستے پر چلنے والا ہزاروں ٹھوکریں کھاتا ہے۔ گرتا ہے' سنبھلتا ہے' پھر ٹھوکر کھاتا ہے اور آخر کار کھائی میں گر جاتا ہے۔'' اسے ایسا لگا جیسے وہ کھائی میں گر رہا ہے۔ اس نے سنبھلنے کی کوشش کی۔ تب ہی اس کی آنکھ کھل گئی۔ کوئی اسے جھنجھوڑ رہا تھا۔ وہ بڑی غفلت کی نیند سو رہا تھا۔

دیکھا' ماں اسے اٹھا رہی ہے۔

''اٹھ نا بیٹا! کب تک سویا رہے گا۔ کام پر نہیں جانا ہے کیا؟''

''ماں! میں نے ایک عجیب خواب دیکھا ہے' بلکہ وہ خواب نہیں ایک سبق ایک چیتاونی تھی۔''

میں راہ سے بھٹک گیا تھا۔ لیکن خدا نے مجھے کھائی میں گرنے سے بچالیا۔

☆☆☆

وطن میں اجنبی

سچ پوچھو تو ملک کے اس بٹوارے میں زیادہ نقصان تو مسلمانوں ہی کا ہوا لیکن ہم بہاری مسلمانوں کا سب سے زیادہ نقصان ہوا ہے۔ سب کچھ لٹا کر ہم ناشاد و نامراد ہی رہے۔ ہم نے کیا کچھ نہیں کھویا۔ عزیز و اقربا' مال و دولت' شان و شوکت' عزت وشہرت اور پیار ومحبت۔

آزادی کی لڑائی میں ہم دوش بدوش رہے۔ قربانی دینے میں پیچھے نہ تھے۔ اس کا ثمر ہمیں کیا ملا۔ یہی کہ در بدر ہوئے۔ گھر سے بے گھر ہوئے۔ وطن سے بے وطن ہوئے۔ وہ وطن جو ہمیں جان سے پیارا تھا' خوشیوں کا گہوارا تھا۔ پھر ایک ایسی آندھی آئی جس نے ہوا کا رخ ہی بدل دیا۔ اپنے پرائے ہو گئے۔ خون کی ندیاں بہیں۔ بربریت کا ایسا ننگا ناچ دیکھنے میں آیا جو آدھی صدی گزر جانے کے بعد بھی لوگوں کے دل ودماغ پر نقش ہے۔ بچہ بچہ اس حادثہ کو نہیں بھول پایا ہے۔

میں بھی اس وقت بچہ تھا۔ ایک بھرے پرے گاؤں کا رہنے والا۔ ہمارا

گاؤں تین سو گھروں پر مشتمل تھا۔ جہاں ہر مذہب، ہر فرقے اور ہر طبقے کے لوگ آپس میں مل جل کر رہتے تھے۔ جو اخوت اور بھائی چارے کی ایک زندہ مثال تھا۔

اپنے گھر کے صحن میں نیم کے پیڑ کے نیچے چارپائی ڈال کر کریم چاچا اور دین دیال پٹواری حقہ گڑگڑاتے رہتے تھے۔ میں جب مدرسے سے لوٹتا تو رگھو ماسٹر کے بیٹے کے ساتھ جی بھر کر گولی کھیلتا۔ جب محرم آتا اور سپر تعزیہ کا اکھاڑ انکلتا تو راموکا کا مجھے اپنے کندھے پر بیٹھا کر اکھاڑے کے ساتھ ساتھ ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں گھماتا رہتا۔ ہماری بیٹھک پر صبح صبح چند لوگ جمع ہو جاتے، جن میں ہر مذہب کے لوگ ہوتے پھر خوب گپیں ہوتیں، قہقہے لگتے۔ پھر اچانک نہ جانے کیا ہوا کہ ماحول میں کشیدگی پیدا ہوگئی۔ ہر طرف سے یہ صدا آنے لگی کہ تمھارا حصہ بانٹ کر مل گیا۔ اب تم یہاں سے دفع ہو جاؤ۔ اگر سہولت اور خوشی سے نہیں گئے تو ڈنڈے کے زور پر مار بھگایا جائے گا۔

بے چارے کاشت کار اور زمین دار یہ سوچتے کہ اپنی زمین جائداد گاؤں اور سماج چھوڑ کر جانا کہاں کی عقل مندی ہے۔

پھر ایک رات ہزاروں بلوائیوں نے ہمارے گاؤں کو گھیر لیا۔ ہمارے جوان اپنی اپنی چھتوں پر چڑھ گئے۔ دونوں طرف سے نعرے بازیاں ہونے لگیں۔ جب ہم بری طرح گھر گئے تو عورتوں نے کنویں میں چھلانگ لگا کر جان دے دی۔ پھر مجھے کچھ یاد نہ رہا۔ دوسرے دن جب ملیٹری فساد پر قابو پانے کے لیے گاؤں آئی تو میں نیم بے ہوشی کی حالت میں ایک ڈربہ میں چھپایا گیا تھا۔ ملیٹری مجھے نکال کر لے گئی۔

میرے ماں باپ، بہن بھائی، عزیز اقربا کہاں گئے، مجھے معلوم نہیں۔ میری بڑی بہن شہر میں محفوظ تھیں۔ ان کے پاس مجھے پہنچا دیا گیا۔ پھر ایک بھگڈرسی مچ گئی۔ کسی کا رخ مغرب کی طرف تھا تو کسی کا مشرق کی طرف۔ آخر کہیں نہ کہیں ہمیں اپنا حق تو حاصل کرنا تھا۔ اتنی بڑی اس دنیا میں کہیں تو ہمارا حصہ ہوگا۔

میری بہن مجھے اپنے ساتھ لے کر مشرقی پاکستان پہنچ گئیں۔ کچھ دن سکون سے گزرے۔ سب اپنی اپنی روزی روٹی میں لگ گئے۔ اپنی گری ہوئی ساکھ بحال کرنی تھی۔ لیکن لوگوں نے کچھ زیادہ ہی پر پرزے نکال لیے تھے۔ یہ بات وہاں کے باشندوں کے دلوں میں کھٹکنے لگی۔ بھلا یہ کیسے برداشت کرسکتا ہے کہ کوئی دوسرا آکر ان کا حق چھینے' ان پر رعب جمائے' ان کی روایت توڑے' ان کی زبان مسخ کرے۔ یہ کانٹا ان کے دلوں میں چبھنے لگا۔ اور دل کی چبھن ایک دن رنگ لا کر ہی رہی۔ نفرت کی چنگاریاں ہر طرف بھڑکنے لگیں۔ دونوں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوگئے۔ اپنی ہی قوم اپنی قوم کا گلا کاٹ رہی تھی۔ جبکہ یہ معلوم ہے کہ اگر ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو ناحق قتل کرے گا تو وہ جنت میں جگہ نہ پائے گا۔ لیکن دنیا کی جنت کے آگے اس جنت کی پرواہ کسے ہے۔ ہر طرف لاشیں ہی لاشیں پڑی تھیں۔ جو زبان حال سے کہہ رہی تھیں:

ہوئے ہم جو مر کے رسوا ہوئے کیوں نہ غرق دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

جنازہ تو اب بھی نہیں اٹھا نہ کہیں مزار بنا۔ یہ کیسی رسوائی دکھ اور حیرت کا مقام تھا۔

ایک بار پھر بہاری مسلمان تباہ ہوئے۔ لٹ پٹ کر کیمپ میں آگئے۔ مشرقی پاکستان جو اب بنگلہ دیش بن چکا تھا' وہ انھیں اپنے یہاں رکھنے کے لیے تیار نہ تھا۔ مغرب انھیں لینا نہیں چاہتا تھا' جن کے لیے انہوں نے جان کی بازی لگائی تھی۔ گویا دو گز زمین کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ کسی کو اگر موقع مل گیا تو وہ پاکستان چلا گیا۔ کوئی اپنے پرانے وطن لوٹ آیا۔ کسی کو اگر کوئی ذریعہ مل گیا تو وہ وہاں سٹل ہوگیا۔ ورنہ جس کا جہاں سینگ سمایا وہیں گھس گیا۔

میرے ساتھ ایک ٹریجڈی اور ہوگئی تھی کہ ایک ناگن نے مجھے ڈس لیا تھا۔ بنگال کا جادو ٹونا تو مشہور ہی ہے۔لہذا ایک بنگالن نے مجھ پر ایسا جادو کیا کہ میں اس کے دام میں پھنس گیا۔ مجھے اپنا اسیر بنالیا۔لیکن جب ہر طرف نفرت کے ناگ لہرانے لگے تو اس نے مجھ سے طلاق کا مطالبہ کردیا یا اس سے کروایا گیا۔لیکن اب یہ ناممکن تھا کیونکہ اب میرا ایک بچہ بھی تھا جس سے جدائی مشکل تھی۔اسے ماں سے جدا کرنا بھی ممکن نہ تھا۔لیکن جب حالات بہت خراب ہوئے تو مجھے ہار ماننی پڑی۔ بچے کا کوئی فیصلہ نہ ہوسکا کیونکہ حالات بد سے بدتر ہوئے گئے۔اور میں ایک بار پھر سب کچھ کھوکر اپنے آبائی وطن لوٹ آیا۔

لیکن اب یہاں ہر چیز مجھے نامانوس سی لگ رہی تھی۔ میں اپنے ہی وطن میں اجنبی کی طرح رہ رہا تھا۔اپنے گاؤں کو پہچاننا مشکل ہورہا تھا۔حالانکہ سب کچھ ویسا ہی تھا۔وہی گلی کوچے' وہی مکان' وہی صحن' وہی نیم اور آم کے پیڑ' وہی باغ باغیچے لیکن وہ خوشبو باقی نہ تھی۔وہاں کی حکومت مجھے قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھی۔کوئی اپنا نہ تھا۔ لہذا وہاں رہنے کا کوئی جواز نہ تھا۔کسی صورت پاکستان پہنچ گیا۔وہاں جگہ تو مل گئی۔مگر یہ بات دل میں ہمیشہ کھٹکتی رہتی ہے کہ ہم نے اپنی پہچان کھودی ہے۔ایک طویل عرصہ گزر جانے کے بعد بھی ہماری شناخت مہاجر کے نام سے ہوتی ہے۔گویا ہم دھوبی کے کتے بن کر رہ گئے ہیں جو نہ گھر کے ہوتے ہیں نہ گھاٹ کے۔

☆☆☆

نوشابہ خاتون

انوکھا محافظ

مجھے ایک دفعہ شملہ جانے کا اتفاق ہوا۔ یہ اتفاق بڑا ہی خوشگوار تھا۔ موسم بھی سیر وتفریح کے لیے بہت سازگار تھا۔ میں ایک ہوٹل میں ٹھہر گیا۔ یہاں کے حالات اور ماحول سے بالکل بے خبر تھا' کیونکہ میں پہلی دفعہ یہاں آیا تھا۔"

فریش ہونے کے بعد سفر کی جو تھوڑی بہت تھکن تھی وہ دور ہو چکی تھی اور بھوک چمک اٹھی تھی۔ میں نے بل بوائے کو چائے اور کچھ کھانے پینے کی چیزیں لانے کے لیے کہا۔ جب وہ چائے لے کر کمرے میں داخل ہوا تو کمرے کی ساری کھڑکیاں کھلی تھیں۔ اس نے چاروں طرف نظریں گھما کر دیکھا اور کہا۔

"صاحب جی! آپ اپنے کمرے کی کھڑکیاں اور دروازے بند رکھنا۔ ورنہ یہ جو چھوٹے چھوٹے بندر ہیں نا وہ آپ کے چھوٹے چھوٹے سامان اٹھا لے جائیں گے۔"

میں نے کہا کہ خدا کا شکر ہے کہ یہ چھوٹے چھوٹے سامان ہی لے جاتے ہیں ورنہ وہ جن سے ہمارا اکثر سامنا ہوتا رہتا ہے وہ ان سے زیادہ خطرناک ہیں۔ موقع

پاتے ہی انسانوں کو نوچ کھسوٹ کرر کھ دیتے ہیں۔

دوسری صبح جب میں مال روڈ کی سیر کے لیے نکلا تو واقعی جگہ جگہ بندروں کا جھنڈ تھا۔ چھوٹے بڑے لاتعداد بندر تھے' جو عجیب وغریب حرکتیں کرر ہے تھے۔ کبھی اچھل کر اس درخت پر تو کبھی اس درخت پر قلابازیاں کھا رہے تھے۔ کبھی اچھل کر کسی مکان کے چھت پر چڑھ جاتے کبھی کسی سیاح کی باسکٹ سے پھل یا کوئی پیکٹ لے کر اس تیزی سے رفو چکر ہوتے کہ بیچارہ باسکٹ والا دیکھتا کا دیکھتا رہ جاتا۔ تیزی اور چالا کی میں وہ انسانوں سے دو ہاتھ آگے ہی تھے۔ ڈارون کے مطابق انسان بندروں کی بدلی ہوئی شکل ہے جو ارتقا کی منزلیں طے کرتا ہوا یہاں تک پہنچا ہے۔ قرآن کے حوالے سے اسے ایک راندی ہوئی قوم سمجھا جاتا ہے۔ جو اپنی نافرمانی کی سزا بھگت رہی ہے۔

جو بھی ہو عقل دنگ ہے لیکن دماغ اس حقیقت کو تسلیم کرنے پر مجبور ہے' کیونکہ اس کی ساری خصلتیں انسانوں سے بہت حد تک ملتی جلتی ہیں۔ وہ سارے جذبے جو ایک انسان میں ہوتے ہیں۔ وہ ان کے اندر بھی موجود ہیں۔

میں نے بسکٹ کا ایک پیکٹ ایک بڑے سے بندر کی طرف بڑھایا جو شاید اپنے گروہ کا سردار تھا۔ اس نے جھپٹ کر پیکٹ میرے ہاتھ سے لے لیا اور بتیسی نکال کر چیں چیں کیا۔ شاید وہ میرا شکریہ ادا کررہا تھا۔ اس جذبہ میں وہ اوروں پر سبقت لے گیا تھا۔ کچھ دور پر ایک بوڑھی سی عورت چیتھڑوں میں لپٹی ہوئی' جس کے رخسار کی ہڈیاں ایک انچ باہر اور گال اندر کی طرف دھنسا تھا' ہاتھوں میں ایک المونیم کا پیالہ لیے ہوئے آنے جانے والوں کی طرف رحم طلب نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ لوگ آتے اور اس کے پاس سے گذر جاتے۔ وہ رحم طلب نگاہوں سے دیکھتی رہ جاتی۔ ایک موٹا تازہ سا بندر اس بڑھیا کے پاس بیٹھا تھا۔ پھر وہ وہاں سے چلا گیا۔

میں قدرت کے حسین مناظر کو کیمرہ میں بند کرنے کے لیے کچھ دیر وہاں کھڑا رہا۔

تبھی وہ واپس آ گیا ہاتھوں میں کیلے کا ایک گچھا لیے ہوئے' جسے اس نے بڑھیا کے پیالے میں رکھ دیا۔ پھر دونوں مل کر آرام سے کھانے لگے۔ اردگرد سارے چھوٹے بڑے بندر جمع ہو گئے۔ لیکن اس موٹے تازے سردار کے آگے کسی کی ایک نہ چلی۔

یہ منظر بڑا ہی دلچسپ اور انوکھا تھا۔ دو مختلف نسلوں کا آپس میں یہ اتحاد' یہ پیار قابل دید تھا۔ اس پیار میں کوئی بناوٹ کوئی تصنع نہ تھا۔ کوئی خودغرضی شامل نہ تھی۔ وہ اپنے بنائے ہوئے رشتہ کو خلوصِ دل سے نبھا رہے تھے۔ اس نظارہ سے لطف اندوز ہونے کے لیے میں روزانہ اس جگہ پہنچ جاتا۔

پھر ایک ہفتہ سیر و تفریح کے بعد واپس آ گیا۔ کچھ دنوں بعد یہ سب باتیں قصہٗ پارینہ بن گئیں۔ لیکن پھر ایک دن کہیں پہنچنے کی جلدی میں میں ایک پتلی سی گلی میں گھس گیا۔ یہ ایک پس ماندہ علاقہ تھا۔ جہاں قطار سے چھوٹے چھوٹے مکان تھے جن میں نچلے طبقے کے لوگ رہتے تھے۔ ایک مکان کے سامنے بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ ایک بڑھیا گھگھیا رہی تھی اور ایک لمبا چوڑا مرد اسے لتاڑ رہا تھا۔

''اس نے چھ ماہ سے ایک پیسہ بھی نہیں دیا ہے' نہ کرایہ دیتی ہے اور نہ کمرہ ہی چھوڑتی ہے۔ باپ دادا کی جاگیر سمجھ لیا ہے۔''

''صبر کر بیٹا بس تھوڑے دنوں کی بات ہے' اگلے ماہ میرا بیٹا آ جائے گا تو میں تیری پائی پائی چکا دوں گی۔'' بڑھیا نے ہاتھ جوڑ کر التجا کی۔

''یہ بات میں چھ مہینے سے سن رہا ہوں۔ یہ صرف مجھے بلف دے رہی ہے۔ اب میں اس کی ایک نہ سنوں گا۔''

''بابو لوگ آپ ہی اسے سمجھائیے۔'' اس نے مجمع کو مخاطب کر کے کہا۔

''میں بڑھیا بے سہارا کہاں بھٹکتی پھروں گی۔''

لیکن مجمع میں سے کسی ایک شخص نے بھی بڑھیا کی حمایت میں ایک لفظ نہ کہا

جیسے سبھوں کو سانپ سونگھ گیا ہو۔

پھر وہ شخص اندر گیا اور اس کا ایک ایک سامان باہر پھینکنے لگا۔

اچانک میری آنکھوں کے سامنے اس بڑھیا اور بندر کے میل جول منظر آ گیا‘ اور میں سوچنے لگا اس انسان اور اس حیوان میں اشرف کون ہے کون محافظ ہے؟

☆☆☆

پت جھڑ

وہ پت جھڑ کی ایک شام تھی۔ خزاں رسیدہ پتے ٹوٹ ٹوٹ کر اطراف میں بکھر رہے تھے۔ ہوا مخالف سمت چل رہی تھی اور ابھی مجھے ایک لمبی مسافت طے کرنی تھی۔

ہواؤں کے رخ کا مقابلہ کرتے ہوئے پتوں کے درمیان راستہ بنا کر گزرنا دشوار ہو رہا تھا۔ پچھلے بارہ برسوں سے آفس جانے آنے کے لیے میں نے یہی راستہ اپنایا تھا۔ کیونکہ ٹیکسی یا بس کا کرایہ ادا کرنے کی اجازت میری جیب نہیں دے سکتی تھی۔ اس راستے سے گزرتے ہوئے اکثر بارش نے میرے جسم کو شرابور کیا تھا۔ کبھی ہوا کے تیز و تند جھکڑوں سے میرے قدم ڈگمگائے تھے، پھر بھی میں ثابت قدم رہ کر اپنی راہ چلتا رہا۔ لیکن اب کوئی راہ سجھائی نہیں دے رہی تھی۔ قدم بری طرح ڈگمگا رہے تھے۔

دو دنوں بعد میرے بیٹے کے پیٹ کا آپریشن ہونے والا تھا۔ ڈاکٹروں نے کہا تھا اگر بروقت آپریشن نہ ہوا تو جان بھی جا سکتی ہے۔ اس تصور ہی سے دل بیٹھا جا رہا تھا۔ اب تک پیسوں کا بندوبست نہ ہو سکا تھا۔ اتنے سالوں کی سروس میں میں تھوڑی رقم بھی

پس انداز نہ کر سکا تھا کیونکہ چھ نفوس کے لیے دال روٹی جٹانا ہی مشکل تھا۔ لکشمی کی دیوی بیک ڈور سے میرے گھر آنے اور مجھے مالا مال کرنے کے لیے تیار تھی لیکن میں نے کبھی اسے اپنے پاس پھٹکنے نہ دیا۔ میرے کئی ساتھیوں نے اپنے ضمیر کو کچل کر اپنی ایک اچھی حیثیت بنالی تھی لیکن میں ابھی تک اسی جگہ کھڑا تھا جہاں پر بارہ سال قبل تھا۔ ان بارہ سالوں میں ایک پرموشن، ایک انکریمنٹ تک نہ مل سکا تھا۔ میرے پاس کسی بڑے آدمی کی سفارش نہ تھی۔ اپنا پرابلم اپنے باس کو بتانا نہیں چاہتا تھا کیونکہ وہ مجھے وہی راہ دکھاتے جس پر چلنے سے ہمیشہ میں نے اپنے قدم روکے تھے۔ شعلوں کی لپٹوں سے دور رہا تھا۔ میرے دوست احباب مجھے بے وقوف سمجھتے ہیں۔ ہاں زمانہ ایسے انسان کو بے وقوف ہی سمجھتا ہے۔ اور میں بھی اچھی طرح جانتا ہوں کہ پیسے ہی میں ساری عقل، سارے گن ہیں۔ پیسوں میں بڑی طاقت ہے۔ لیکن ایک طاقت اس سے بھی بڑی ہے اور وہ ہے ایمان کی طاقت اور میں اسی کے سہارے مطمئن اور آسودہ تھا۔ ہوس کے پیچھے بھاگنا میری فطرت نہیں تھی۔ انسان کی خواہشیں تو لامحدود ہیں۔ غالب نے ٹھیک ہی کہا ہے:

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پر دم نکلے

لیکن آج خواہشوں نے نہیں بلکہ ضرورتوں نے مجھے پریشان کر رکھا ہے۔ حوصلہ پست کر دیا ہے، توانائی چھین لی ہے۔ میں خود کو گھسیٹتا ہوا کسی طرح کافی دیر سے گھر پہنچا۔ بہن نے دروازہ کھولا۔ اس کا پژمردہ چہرہ دیکھ کر ایک سال قبل کی یاد تازہ ہوگئی۔ میں اس کا سامنا کرنے سے کتراتا تھا، کیونکہ اس کی بدنامی اور بربادی کا ذمہ دار میں خود کو سمجھتا تھا۔

ابا کے گزر جانے کے بعد اماں اور بہن کی ذمہ داریوں کا بوجھ بھی اس ناتواں کندھوں پر آ گیا تھا۔ یوں تو سب کچھ ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا، لیکن بہن کی شادی کا مسئلہ درپیش تھا۔ اماں کو کچھ جلدی بھی تھی۔ بہر کیف ایک جگہ رشتہ طے پا گیا۔ عنقریب ہی

شادی ہونے والی تھی۔

ایک شام جب میں آفس سے آیا تو اماں نے ایک پرزہ میرے ہاتھ میں تھمادیا۔ وہ خواہشوں اور فرمائشوں کی ایک لمبی فہرست تھی۔ میں سوچ میں پڑ گیا۔ ان کا یہ مطالبہ پورا کرنا میرے بس سے باہر تھا۔ پھر بھی میں نے ہمت نہ ہاری۔ اور اس موضوع پر بات چیت کرنے کے لیے ان کے یہاں پہنچ گیا۔ دیر تک بحث حجت ہوتی رہی۔ پھر انھیں نیم رضامندی کی کیفیت میں چھوڑ کر میں واپس آ گیا۔ میں ان کے فیصلے کا منتظر تھا اور خدا کا شکر تھا کہ حالات موافق ہی رہے۔ پروگرام کے مطابق بارات آئی۔ سب کچھ خیر وخوبی سے انجام پا گیا لیکن شادی کے چوتھے دن وہ طلاق نامہ ہاتھ میں لے کر واپس آ گئی۔

ہمارے ہوش وحواس اڑ گئے۔ معاشرے میں پھیلی ہوئی اس لعنت نے ہمیں بھی نہیں بخشا تھا۔ پھر بھی میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ میری بہن لقمہ اجل ہونے سے بچ گئی۔ دو چار لقمے زہر مار کر کے میں کمرے میں آ گیا۔ میری بیوی نے امید بھری نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''پیسوں کا بندوبست ہو گیا؟''

میں خاموش رہا لیکن اس نے خاموشی کی زبان سمجھ لی اور اس کی آنکھوں سے ساون بھادوں کی جھڑی لگ گئی جس نے مجھے اور بھی بے کل کر دیا۔

میرے پاس وقت بہت کم تھا۔ صرف ایک دن باقی بچا تھا۔ اس بیچ مجھے کوئی فیصلہ کرنا تھا۔ دو میں سے کسی ایک کو چننا تھا۔ بیٹے کی موت یا ضمیر کی موت......جو کچھ ہونے والا تھا وہ منظر بار بار میری آنکھوں کے سامنے آ رہا تھا۔ بچہ تکلیف سے پوری رات بے چین رہا۔ صبح ذرا اس کی آنکھ لگی۔ چہرے پر مردنی چھائی ہوئی تھی۔ میں ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا اور بے چینی کے عالم میں ٹہلنے لگا۔ میرے اندر ایک جنگ چھڑی ہوئی تھی۔

یہ جنگ کئی گھنٹے جاری رہی۔ گاہے گاہے بچے کی نحیف کراہ میرے ارادے کی پختگی کو متزلزل کرتی رہی۔ پھر نہ جانے کن کمزور لمحوں کی زد میں آ کر میں نے ہتھیار ڈال دیے۔

تیار ہو کر آفس گیا، دبی ہوئی فائلیں نکلوا کر سائن کیا۔ باس سے ملا۔ چھٹی کی درخواست دی۔ پیسے قرض لیے۔

دنیا کے موہ مایا نے مجھے کتنا بے بس اور کمزور بنا دیا تھا۔ معاشرے میں پھیلی ہوئی بدعنوانیاں انسان کو چین سے جینے نہیں دیتی ہیں۔

جب میں وہاں سے لوٹ رہا تھا تو میری گردن خود بخود جھکتی چلی جا رہی تھی اور آنکھیں ضمیر کی موت پر نوحہ خواں تھیں۔

☆☆☆

نوشابہ خاتون

لکیر کے فقیر

میرا جی چاہتا ہے کہ سینہ تان کر، فخر سے سر اونچا کر کے لوگوں کو یہ باور کراؤں کہ میں بھی ایک مشہور و معروف گاؤں کا باشندہ ہوں۔ لیکن آج ٹوٹا پھوٹا بکھرا ادھر اُدھر پڑا ہوں۔ کہا جاتا ہے کسی زمانے میں شہنشاہ وقت نے کسی کام سے خوش ہو کر ہمارے آباء واجداد کو ایک بڑی جاگیر دی تھی' اور ساتھ ہی خان بہادر کے خطاب سے بھی نوازا تھا۔ پھر کیا تھا..... ہزاروں رنگین، کھٹی میٹھی، تلخ و شریں داستانیں ان کی ذات سے وابستہ ہوگئیں، جنہیں ہمارے والد صاحب ہمیشہ بیان کرتے رہتے۔ ان کا انداز بیان بہت ہی موثر اور ڈرامائی ہوا کرتا تھا۔ ایسی تصور یر کشی کرتے کہ لگتا بندہ خود اسی ماحول میں پہنچ گیا ہو۔ راجہ مہاراجہ کے دربار کا منظر نظروں کے سامنے گھوم جاتا' اور میں آنکھیں بند کر کے دیر تک لطف اندوز ہوتا رہتا۔ میری فرمائش پر انہوں نے اتنی بار یہ داستانیں سنائی تھیں کہ مجھے ازبر ہوگئی تھیں۔ اگر میں مصنف ہوتا تو الف لیلیٰ جیسی ضخیم کتاب تیار ہو جاتی۔

بڑے سرکار یعنی ہمارے پردادا کی بڑی نوابی شان تھی۔ سیکڑوں نوکر چاکر، مصاحب، ہالی موالی، درباری، بھانڈ، قوال اردگرد جی حضوری میں لگے رہتے۔ انہوں نے سینکڑوں شوق پال رکھے تھے۔ پتنگ بازی، کبوتر بازی، بٹیر بازی، اور چوسر و شطرنج۔ اسی طرح کے کئی اور مشاغل بھی تھے۔ بڑے سرکار شکار کے بھی بڑے شوقین تھے۔ چاندنی راتوں میں شکار کرنا اور شطرنج کھیلنا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ باہر صحن میں ایک بہت ہی عظیم الشان پیپل کا درخت تھا۔ جس کی کئی شاخیں حویلی کے صحن کی طرف جھکتی تھیں، جس کے نیچے شطرنج کی محفل جمتی تھی، جہاں اکثر عجیب و غریب واقعات رونما ہوتے رہتے تھے۔ کہتے ہیں کہ اس درخت پر آسیب کا سایہ تھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جہاں ان کا سایہ ہوتا ہے وہاں ہن برستا ہے۔ اب واللہ اعلم اس بات میں کہاں تک صداقت ہے۔ البتہ یہ پراسرار اور پرتحیر واقعات کسی طلسم ہوش ربا سے کم نہ تھے اور ہن تو واقعی برس رہا تھا۔ جب کبھی قحط پڑتا یا کوئی پریشانی ہوتی تو پورے گاؤں میں منادی کروائی جاتی اور دربار میں حاجت مندوں کی قطار لگ جاتی۔ پھر تجوری اور کوٹھی کا دہانہ کھول دیا جاتا۔

اس زمانہ میں نوابوں اور زمینداروں کے یہاں آم کے باغات بہت ہوا کرتے تھے۔ ہمارے دادا، پردادا کی جاگیر میں بھی بڑے بڑے آم کے باغ تھے، جن میں بڑے ہی نادر اور نایاب قسم کے قلمی آم ہوا کرتے تھے، جو اس قدر شیریں اور خوش ذائقہ ہوتے کہ ہفتوں منہ میں اس کا مزہ باقی رہتا اور ہر خاص و عام اس سے فیض یاب ہوتا اور جو پھل وہاں نہیں ہوتے وہ دوسری جگہوں سے منگوائے جاتے۔ خاص کر لکھنو سے جھاوے کا جھاوا خربوزہ آتا جو بہت ہی کم اپنی صحیح حالت میں پہنچ پاتا۔ لیکن بڑے سرکار کا یہ کہنا تھا کہ سو جھاوے میں ایک جھاوا ایک جھاوے میں ایک پھل اور ایک پھل کی ایک قاش اگر ذائقہ پر اتر جائے تو سمجھو سارے پیسے وصول ہو گئے۔ تو جناب یہ تھی آن بان ہمارے آباء واجداد کی۔

بڑے سرکار کے بعد ہمارے دادا کا زمانہ آیا۔ اس وقت تک کم وبیش ویسا ہی دور دورہ تھا۔ پھر دھیرے دھیرے حالات زوال پذیر ہوتے گئے۔ لیکن وہ لوگ قسمت کے دھنی تھے' چاندی سونے کا چمچہ منہ میں لیکر پیدا ہوئے تھے۔ پوری طرح زوال آنے سے قبل ہی رخصت ہوگئے۔ چمچہ تو ساتھ لے گئے' پیالہ ہمارے ہاتھوں میں پکڑا دیا۔ اور ہمارے نام کے ساتھ خان بہادر کا دم چھلا لگا دیا جوان کی شان وشوکت کی یاد تازہ کرنے کے لیے کافی ہے اور پیچھے چھوڑ گئے بہت ساری داستانیں اور بہت ساری اولادیں۔ ان میں سے کچھ تو اس لہو ولعب کی دنیا سے باہر نکل گئے اور کچھ شان وشوکت کی گزری ہوئی یادوں کو کلیجے سے لگا کر باپ دادا کی گذری زندگی آباد کرتے رہے۔

ایک دن والد صاحب کی ڈانٹ پھٹکار سن کر میں نوکری کی تلاش میں نکل پڑا۔ بہت ہی تگ ودو کے بعد مجھے ایک جوتے کی دوکان میں نوکری مل گئی۔ میرا کام دس بجے دن سے رات کے دس بجے تک گاہکوں کو جوتے پہنانا تھا۔ اس وقت مجھے والد صاحب کی بتائی ہوئی وہ بات یاد آجاتی کہ ہمارے بزرگوں کے یہاں جوتے پہنانے کے لیے خاص ملازم ہوا کرتے تھے۔ اس خیال کے آتے ہی میرے ہاتھ کانپ جاتے اور پیشانی عرق آلود ہو جاتی۔ ہمارے خون میں اب بھی کچھ ایسا تھا جس نے میری غیرت کو للکارا اور میں لاحول پڑھ کر نوکری کو خیر باد کہتا ہوا واپس اپنی گدی پر جا بیٹھا۔

لوگ کہتے ہیں کچھ ہو نہ ہو ہم میں ایک زبردست خوبی ہے۔ ہم ہر حال میں خوش ہیں' پھٹے پرانے میں مست ہیں۔ بے ضرر اور قناعت پسند ہیں۔ ہاں ایک خوبی ہم میں اور بھی ہے' شاید وہ وراثت میں ملی ہے۔ ہم چھوٹی چھوٹی باتوں پر بحث کرنے کے لیے تل جاتے ہیں تو ساری ساری رات بحث میں گزار دیتے ہیں۔ ہم ان ہی حماقتوں میں جی رہے ہیں۔ حویلی خستہ حالی کو پہنچ گئی ہے۔ کہیں کواڑ اکھڑ گئی ہے تو کہیں کھڑکی غائب ہے۔ کہیں چھت ٹپک رہی ہے تو کہیں شہتیر ٹوٹ کر لٹک رہی

ہے۔ لوگ کھلی اڑاتے ہیں۔ اب میں لاکھ چلاؤں، ہزار لوگوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کروں کہ اس خستہ حالی پر نہ جاؤ۔ ہمارے دادا پر دادا نے بہت بڑے بڑے کارنامے انجام دیے ہیں لیکن وہ یہی پوچھیں گے۔

"میاں تم نے کیا کیا؟ دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی اور تم لکیر کے فقیر رہ گئے۔"

☆☆☆

جانے کہاں گئے وہ دن!

وہ اکثر سوچتا۔

کہاں گئے وہ دن، کہاں گئیں وہ رعنائیاں؟

رہ گیا میں اور میری تنہائیاں!

تنہائی ایک شراپ ہے، ایک بددعا ہے۔ جو نہ جانے کب، کیوں اور کس نے اسے دی تھی۔

بیس سال کا طویل عرصہ گزر جانے کے بعد بھی وہ اب تک ان بددعاؤں کے حصار سے باہر نہیں نکل پایا تھا۔ تنہائی کا زہر گھونٹ گھونٹ پی رہا تھا۔ کچھ بھی تو نہیں بدلا تھا۔ نہ چاند، نہ تارے، نہ شام نہ صبحیں۔ وہی یکسانیت، وہی معمول۔ وہی آفس، وہی گھر۔ سب کچھ بدستور ویسا ہی تھا۔ اگر کچھ بدلا تھا تو یہ دل جو یکلخت ویران ہو گیا تھا۔ اب اس میں نہ کوئی اُمنگ تھی، نہ کوئی آرزو، اور نہ ہی کسی کے پیار کی ہلکی سی رمق بھی باقی بچی تھی۔

یہ دل جو کبھی اپنوں کے پیار سے لبریز رہا کرتا تھا یکسر خالی ہو چکا تھا۔

اور بے کیف زندگی کا سفر جاری تھا۔

باقی رہ گئیں تھیں چند یادیں اور ماضی سے جھانکتی ہوئی چند تصویریں، جنھیں ان بیس سالوں میں ناس نے نہ جانے کتنی بار دیکھا تھا، انھیں چھوا تھا، انھیں چوما تھا، ان سے باتیں کی تھیں، اپنی تنہائیوں کی داستانیں سنائی تھیں اور گھنٹوں آنسو بہائے تھے۔ لیکن کاغذ کے یہ بے جان ٹکرے درد کا مداوا تو نہیں بن سکتے تھے۔ پھر بھی یہی تصویریں تنہائی دور کرنے کا واحد سہارا تھیں۔

اس نے البم کھولا۔ پہلے ورق پر اماں ابا کی تصویریں تھیں، جنھیں دیکھ کر اسے یاد آگئیں اماں کی لوریاں، دادی کی کہانیاں اور ابا کی جھڑکیاں۔ وہ ندی نالے اور پنگھٹ پر گوریوں سے چھیڑ خانیاں۔ ابا اس کی ان حرکتوں سے نالاں تھے۔ وہ اسے ایک ہونہار بیٹے کے روپ میں دیکھنا چاہتے تھے۔ مگر ان کی ہزار ڈانٹ پھٹکار پر بھی وہ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آتا تھا۔ دوستوں کے ساتھ آم کے باغ میں گھس جاتا جہاں کوئل کی نغمہ سرائی اسے پرکشش لگتی۔ پیڑ پر چڑھ کر کچی کچی کیریاں کھاتا اور کتر کتر کر نیچے پھینکتا۔ پھر مالی کی للکار پر دھپ سے نیچے کود کر سرپٹ دوڑ جاتا۔ جب مالی اس کا تعاقب کرتا تو ایک مٹھی دھول اس کی آنکھوں میں جھونک کر قلانچیں بھرتا ہوا بھاگ جاتا۔

وہ گلی کوچے، وہ سہہ دریاں جہاں شطرنج کی لگتی تھیں بازیاں۔

وہ اکثر سوچتا۔

کہاں گئے وہ دن، کہاں گئیں وہ رعنائیاں؟

رہ گیا میں اور میری تنہائیاں!

کسی طرح گرتے سنبھلتے اس نے سترہ سالوں کا سفر طے کر لیا۔ وقت نے پلٹا کھایا تو وہ کالج پہنچ گیا اور کالج کی رنگینیوں میں کھو گیا۔ ابا کے چہرے پر رونق آگئی۔ امید کی کرنیں چمک اُٹھیں۔ اب وقت آگیا تھا انھیں اپنا حق، اپنی شفقتیں، اپنی

محبتیں کیش کرانے کا۔

اس نے البم کا ایک اور ورق پلٹا۔سامنے معصوم سی سیدھی سادی مسکراتی آنکھوں اور لمبے بالوں والی ثمینہ کھڑی تھی، جیسے اب بول پڑے گی۔لیکن وہ بات کرنے میں بہت کنجوس تھی۔بولتی کم اور سنتی زیادہ تھی۔وہ بولتے بولتے تھک جاتا تو جھنجھلا جاتا۔

''کیا تمھارے منہہ میں زبان نہیں ہے؟'' وہ مسکرا دیتی۔

''ہے،لیکن کسی دانشور نے کہا ہے کہ بولو کم اور سنو زیادہ کیونکہ خدا نے زبان تو ایک دی ہے مگر کان دو دیے ہیں۔''

ثمینہ کالج کے تڑک بھڑک اور ہاؤ ہو سے دور ایک الگ قسم کی مخلص لڑکی تھی۔اس کی انھی خوبیوں نے اسے اپنا اسیر کرلیا تھا۔لیکن وہ نہ جانے کیوں ہر وقت خیالوں میں ڈوبی رہتی۔گھنٹوں ایک نقطہ پر نگاہیں جمائے نہ جانے کیا سوچتی رہتی۔وہ اس کی خاموشی کا راز جاننا چاہتا تھا۔آخر ایک دن وہ راز آشکار ہو ہی گیا۔وہی حالات کی چکی میں پستی ہوئی زندگیاں۔بوڑھے ماں باپ جو قبل از وقت بوڑھے ہو گئے تھے چھوٹے چھوٹے بھائی بہن،تعلیمی اخراجات،سفید پوشی کا بھرم!

اس کی آنکھیں چھلک پڑیں۔

''کب میں اپنے والدین کا سہارا بنوں گی؟''

وہ خاموش نگاہوں سے دیکھتا رہا۔زبان سے کچھ نہ کہہ سکا،لیکن دل نے کہا،میں تمھارا سہارا بنوں گا۔

اس نے کالج کی تعلیم ختم کرلی۔اسے نوکری بھی مل گئی۔اس دوران ایک بڑے گھر سے اس کا رشتہ آگیا۔ابا کی آنکھوں میں چمک آگئی۔نظر آنے لگیں نوٹوں کی موٹی موٹی گڈیاں۔

لمبی لمبی چمچماتی گاڑی اور ڈیکوریٹڈ کوٹھی۔لیکن وہ ثمینہ کے لیے راہ ہموار

کرنے میں لگا تھا۔ ابا کو منانے کی کوشش کر رہا تھا۔

ابا کا کہنا تھا کہ انسان کو ہمیشہ اونچائی کی طرف دیکھنا چاہیے۔ نیچے دیکھنے والے گڈھے میں گر جاتے ہیں اور پھر زندگی بھر اس سے نکل نہیں پاتے۔ ان مڈل کلاس والوں کی ذہنیت ہی پست ہوتی ہے۔ وہ صرف دنیا کی آبادی میں اضافہ کرنا جانتے ہیں۔ درمیان میں خدا کو لے آتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ رزق دینے والا وہ داتا ہے' پھر ہم کیوں ناحق اپنی گردن پر معصوموں کے خون کا الزام لیں؟ بیشک رزق دینے والا وہی ہے مگر اسی نے ہمیں عقل بھی دی ہے.....''

ابا کا لکچر لمبا ہو جاتا تو وہ سرک جاتا۔ باپ بیٹے کے درمیاں رسہ کشی جاری تھی۔ وہ اپنی ہٹ پر تھے اور یہ اپنی ضد پر۔ آخر امیری جیت گئی' غریبی ہار گئی۔

اس نے کبھی ثمینہ سے کوئی وعدہ نہیں کیا تھا' اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی تھی' لیکن وہ دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں کا مفہوم اچھی طرح سمجھتے تھے۔ وہ ایک اداس شام تھی جب اس ثمینہ کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دیا۔

''ثمینہ' میں ہار گیا۔ فرض نے میرے پاؤں جکڑ لیے۔ والدین کی محبتوں کا قرض جو اتارنا تھا۔ مجھے معاف کرنا۔ شکوہ کر کے کبھی مجھے شرمندہ مت کرنا۔'' ثمینہ کے چہرے پر ایک سایہ سا لہرایا۔

''کیسے گلے شکوے' کیسی معافیاں؟ میں نے کب تم کو تم سے مانگا تھا؟ ہمارے راستے تو شروع سے الگ تھے۔''

پھر تنہائیوں کا سفر شروع ہو گیا۔ ثمینہ کی یادیں زاد راہ بن گئیں۔ آدھا البم ثمینہ کی تصویروں سے بھرا پڑا تھا' جو پل پل کی یاد دلاتی تھیں۔

اب جو ورق اس نے پلٹا تو سامنے ایک سجی سجائی دلہن بیٹھی تھی۔ سرخ جوڑا' سرخ چوڑیاں۔ ہاتھوں میں مہندی اور مانگ میں ٹیکا' لیکن آنکھوں میں شرم و حیا کی لالی

نہ تھی پھر بھی وہ اسے اچھی لگی کہ اب یہی اس کی دلہن تھی۔ اماں ابا خوش تھے تو وہ بھی خوش تھا۔ دونوں ہنی مون پر کئی جگہ گئے۔ وہ نازوں پلی کے ناز اُٹھاتا رہا۔ آدھا البم انھی تصویروں سے بھرا پڑا تھا۔ بھاگتے دوڑتے، آبشار کو مٹھی میں قید کرتے ہوئے، برف پر پھسلتے ہوئے۔ ان رنگ رلیوں میں دو سال سرک گئے۔ وقت نے ایک اور کروٹ لی۔ اماں ابا بچوں کی کلاریاں سننے کے لیے بے چین تھے۔ لیکن اس کی بیوی کو اپنا فیگر عزیز تھا۔ وہ کہتی، ابھی دس سال تک اس کے بارے میں سوچنا بھی نہیں ہے۔ اس بات پر دونوں میں ہمیشہ جھگڑا ہوتا۔ وہ روٹھ جاتی اور میکے سدھارتی۔ آزاد ماحول کی پروردہ کو سسرال یوں بھی پسند نہیں آتا۔ وہ شوہر کو بھی اپنے ساتھ لے جانا چاہتی تھی۔ لیکن اسے یہ گوارا نہ تھا۔ کہتے ہیں کہ گھر داماد اور گھر کے پالے ہوئے کتے میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ اور اسے کتا بننا منظور نہ تھا۔ آخر ایک دن وہ ہمیشہ کے لیے میکے جا کر بیٹھ گئی اور طلاق کا مطالبہ کر بیٹھی۔ والدین پوتے کی آرزو دل میں لیے ملک عدم کو روانہ ہو گئے۔ اب وہ بالکل تن تنہا تھا۔

ثمینہ کی یاد کبھی اس کے دل سے دور نہ ہو سکی۔ اتفاقاً ایک دن اس سے سرراہ ملاقات ہو گئی۔ وہ مدتوں بعد ملے تھے۔ دونوں کے چہرے سے خوشی چھلکی پڑ رہی تھی۔

''کیسی ہو ثمینہ؟'' اس نے بے تابی کے ساتھ پوچھا۔

''فائن! اور تم؟''

''میں بھی ٹھیک ہی ہوں۔''

''سنا ہے تم نے شادی کر لی۔''

''ہاں! اور تم بھی تو......''

''یہ میری مجبوری تھی۔ والدین کی خواہش کے آگے ہتھیار ڈالنے پڑے۔''

''یہی مجبوری میری بھی تھی۔ ویسے بھی یہ فطرت اور سماج کا اہم تقاضہ ہے اور

اس تقاضے کو پورا کرنا انسان کی مجبوری ہے۔''

''کیسے ہیں تمھارے شوہر؟''

''کبھی میرے گھر آؤ تو ان سے تمھیں ملواؤں۔ تمھیں ایک سرپرائز بھی دینی ہے۔''

''آؤں گا' ضرور آؤں گا۔''

ایک دن وہ ثمینہ کے بتائے ہوئے پتہ پر پہنچ گیا۔ چھوٹا سا صاف ستھرا مکان تھا۔ دو ننھے منے پیارے سے بچے تھے۔ ایک شخص بیساکھی کے سہارے اندر کے کمرے سے نمودار ہوا۔ ثمینہ نے آگے بڑھ کر اسے سہارا دیا اور بڑی خندہ پیشانی سے دونوں کا تعارف کرایا۔ وہ مبہوت سا کھڑا یہ سوچ رہا تھا کہ ثمینہ مجھے کیا سرپرائز دینا چاہتی ہے' کیا دکھانا چاہتی ہے؟ دو پیارے پیارے بچے یا اپاہج شوہر؟ اس نے محسوس کیا کہ ثمینہ اپنے شوہر کا خاص دھیان رکھ رہی ہے۔ وہ بار بار مسکرا کر اس کی جانب دیکھ رہی ہے۔ اس کے اندر جیسے کچھ ٹوٹ پھوٹ گیا۔ وہ خالی دل لیے ہوئے وہاں سے واپس آ گیا۔

تنہائی کا سفر بدستور جاری ہے۔ وہ اکثر سوچتا ہے۔

کہاں گئے وہ دن' وہ رعنائیاں!

رہ گیا میں اور میری تنہائیاں۔

☆☆☆

سہانا سفر اور یہ موسم حسیں

موسم واقعی بڑا حسین تھا۔ یہ نغمہ خود بخود میرے ہونٹوں پر آرہا تھا اور میں راگ الاپتا ہوا بیخودی میں چلا جارہا تھا۔ میرے اندر کا موسم بھی بڑا خوشگوار تھا۔ آج میری قسمت کا ستارہ چمکنے والا تھا۔ کئی مہینوں کی تگ ودو کے بعد ایک پرائیویٹ کمپنی میں اکاؤنٹنٹ کے لیے میرا سلکشن ہوا تھا۔ اب چند رسمی سوال و جواب کے بعد مجھے اپنا عہدہ سنبھالنا تھا۔

جب میں دفتر پہنچا تو ایم ڈی صاحب آچکے تھے۔ چپراسی کی مدد سے میں ان کے آفس تک پہنچا۔ میں سلام کر کے ایک طرف کھڑا ہونا ہی چاہتا تھا کہ انہوں نے اپنے سامنے والی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''تشریف رکھئے۔''

میں ان کا شکریہ ادا کر کے بیٹھ گیا۔ وہ ایک معمر شخص تھے۔ انہوں نے اوپر سے نیچے تک میرا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

''تو آپ ہی محمد یوسف ہیں؟''

''جی خاکسار کو یوسف ہی کہتے ہیں۔''

''ہاں تو جناب آپ کرتے کیا ہیں؟''

''کچھ کرتا کہاں ہوں' سر اسی لیے تو آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔''

''میرا مطلب ہے اب تک کیا کرتے رہے ہو؟''

''بس نوکری کی تلاش میں چپلیں توڑتا رہا ہوں۔''

بات دراصل یہ ہے سر' کہ زمینداری کا زمانہ گزر گیا۔ گرانی عروج پر ہے۔ دنیا داری بھی نبھانی ہے۔ باپ دادا نے کچھ چھوڑا نہیں۔ اور اب کمپیٹیشن کا زمانہ ہے۔ دنیا شو اور فیشن کے پیچھے بھاگ رہی ہے تو جناب میں بھی کیوں پیچھے رہوں۔ چپل کیا' ممکن ہے کبھی سر تڑوانے کی نوبت بھی آجائے۔''

انہوں نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔

''بڑی دلچسپ باتیں کرلیتے ہو۔'' پھر انہوں نے جاب سے متعلق کچھ سوالات کیے' کچھ ہدایتیں دیں۔ بات مکمل ہوجانے پر میں نے اجازت مانگی اور آفس سے نکل گیا۔ شام کو مٹھائی کے ڈبوں سے لدا پھندا جب میں گھر پہنچا تو بہن بھائی نے گھیر لیا۔ امی نے چٹا چٹ بلائیں لے ڈالیں۔ ہزاروں دعائیں دیں۔ میں نے شہادت کی انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''امی اپلیز ایک دعا اور۔'' امی مسکرا دیں اور ایک دھول جما کر کہا۔

''چل ہٹ! شادی کے لیے باؤلا ہوا جارہا ہے۔''

''تو کیا غلط کر رہا ہوں امی؟'' ان کا اندازہ تھوڑا صحیح تھا تھوڑا غلط۔ مجھے بیوی کی نہیں بلکہ ایک محبوبہ کی اشد ضرورت تھی۔ جو میری سونی زندگی کو سہانا بنادے۔ روایتی عشق مجھے پسند نہیں جس میں اکثر جان دینے کی نوبت آجاتی ہے اور کبھی کبھی تلوے بھی

چاٹنے پڑتے ہیں۔ بہر کیف پہلے مُیں نوکری کی تلاش میں پریشان تھا اور اب ایک عدد محبوبہ کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ لیکن وہ دستیاب نہیں ہو رہی تھی۔ کاش وہ بازار میں بکنے والی کوئی شے ہوتی۔ لیکن وہ بکتی نہیں ہے' بلکہ خریدار ہے۔ عاشق خریدتی ہے' شوہر خریدتی ہے' ساس سسر خریدتی ہیں۔ شرط یہ ہے کہ جیب میں کتنے پیسے ہیں۔ جیب جتنی بھاری ہوتی ہے' مال اتنا ہی عمدہ ملتا ہے۔ جسے وہ اپنی خواہش کے مطابق استعمال کرتی ہے۔ کیونکہ خریدی ہوئی چیز پورا پورا اختیار ہوتا ہے۔

عاشق کا کام ہے تلوے چاٹنا۔ شوہر بے چارے بھی کیا کریں' سر جھکائے رہتے ہیں' کیونکہ گلے میں پٹا جو پڑا ہوتا ہے۔ ساس واری بلہاری ہو کر قرض چکاتی ہیں اور سسر تو حکم کے بندے ہیں۔ جدھر گھماؤ ادھر ہی گھومتے ہیں۔

میں نے تو تلوے چاٹنے والا عاشق بننا چاہتا تھا اور نہ ہی گلے میں پٹا پڑا ہوا شوہر۔ میں تو ہلکے پھلکے عشق کا قائل تھا۔ اسی لیے اب تک نامراد تھا۔

ایم ڈی صاحب اب اکثر مجھے اپنے آفس میں طلب کرتے۔ وہ بڑی ہی دلچسپ باتیں کرتے۔ خود بھی ہنستے اور مجھے بھی ہنساتے۔ شاید گھر پر ان کے لیے کسی کے پاس وقت نہیں تھا۔ ویسے بھی ہائی سوسائٹی میں کون کسے گھاس ڈالتا ہے۔ بچوں کی الگ ہی دنیا ہے۔ اگر وہ اسٹوڈنٹ ہیں تو صبح اٹھتے ہی کچھ دیر ڈک پر تھرکتے ہیں۔ پھر کالج جاتے ہیں۔ شام میں دوست احباب اور سیر و تفریح سے فرصت نہیں ملتی۔ اگر وہ شادی شدہ ہیں تو اور بھی عنقا ہیں۔ ویسے اس سوسائٹی کے بوڑھے بھی کم رنگیلے نہیں ہوتے۔ لیکن ہمارے ایم ڈی صاحب بہت شریف تھے۔ خدا نہ کرے کہیں بے چارے کی بیوی نہ فوت ہو چکی ہوں۔

ایک دن انہوں نے اپنی صاحب زادی بلند اقبال کی برتھ ڈے پارٹی پر مجھے مدعو کیا۔ اور اندھا چاہے دو آنکھ کے مصداق میں نے بلا عذر ان کی دعوت قبول کر لی۔

وہ برتھ ڈے پارٹی کیا تھی بس سمجھ لیجیے کہ عریانیت کا سمیلن تھا۔ لڑکے لڑکیاں ٹولیاں میں بٹ کر ناچ رہے تھے۔ ایک دوسرے کے ہم آغوش ہو رہے تھے۔ ذکر و اناث کا فرق مٹ گیا تھا۔ بہت غور کرنے کے بعد اتنا فرق سمجھ میں آ رہا تھا کہ لڑکیوں کے ہونٹوں پر لپ اسٹک تھی اور لڑکے کے گالوں پر۔ ہاں ایک اور نمایاں فرق تھا کہ لڑکوں کے جسم پر تو بھرپور کپڑے تھے، لیکن لڑکیاں اپنے جسم کی زیادہ سے زیادہ نمائش کے شوق میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ اس کوشش میں ان کے جسم پر بس ایک آدھ گز کپڑا ہی بچا ہوا تھا۔ میں کبھی آنکھیں بند کر لیتا اور کبھی آنکھوں کو ٹمٹما کر یہ یقین کرنے کی کوشش کرتا کہ آیا میں جاگ رہا ہوں یا خواب دیکھ رہا ہوں۔

جب گھڑیال نے رات کے، بارہ بجائے تو رقص کا زور کم ہوا۔ کتنے تو فرش پر ہی لمبا لیٹ ہو گئے اور جو بچے انہوں نے اپنے گھر کی راہ لی۔

میں تقریباً دو بجے گھر پہنچا۔ امی نے دروازہ کھولا۔ بہت ہی گھبرائی ہوئی تھیں وہ۔

''اتنی دیر کہاں رہ گیا تھا بیٹا! آج سے پہلے اتنی رات تک تو گھر سے باہر کبھی نہیں رہا تھا۔ میرا دل ہول رہا تھا کہ کہیں میرا بچہ کسی آفت میں نہ پھنس گیا ہو۔''

''آپ نے ٹھیک سمجھا تھا امی! آپ کا بیٹا بہت بڑی آفت میں گھر گیا تھا۔''

ایک شام میں آفس سے نکل کر بس پکڑنے کے لیے جا رہا تھا کہ ایم ڈی صاحب کی گاڑی میرے پاس آ کر رک گئی۔ انہوں نے کہا۔

''آیئے یوسف میاں آج کی شام میرے نام ہو جائے۔''

اور میں فرماں بردار بچے کی طرح بلا چون و چرا ان کے بازو میں جا کر بیٹھ گیا۔ وہ مختلف موضوع پر گفتگو کرتے رہے اور مجھے پتہ بھی نہ چلا کہ کب وہ مجھے لیے ہوئے

اپنے گھر پہنچ گئے۔

اس روز انہوں نے مجھے اپنی فیملی کے بارے میں بہت کچھ بتایا۔ میرا قیاس صحیح تھا۔ واقعی ان کی اہلیہ گزر چکی تھیں۔ دو بیٹے شادی شدہ تھے جو امریکہ میں سیٹل ہو چکے تھے۔ ایک بیٹا اور ایک بیٹی زیر تعلیم تھے۔ ایک یتیم بھانجی کو گلے لگایا تھا۔ دونوں لڑکیوں میں سے ایک تیز وطرار الٹرا موڈرن جینس اور شارٹ شرٹ زیب تن کیے تھیں۔ اور دوسری سیدھی سادھی سادے کپڑوں میں ملبوس تھی۔ ایک کی زبان قینچی بن کر دل کو تراش رہی تھی تو دوسری کی مسکراہٹ خرمن ہستی پر بجلی گرا رہی تھی۔ بڑے میاں نے ان دونوں کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

''ان سے ملیے یہ ہیں میری صاحب زادی رعنا حسن۔ انہوں نے جینس والی طرف اشارہ کیا اور یہ میری بھانجی نسیم فاطمہ۔''

اور اب وہ مجھے اکثر اپنے ساتھ چلنے کی دعوت دیتے۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ میں خود اس کا منتظر رہتا۔ کیونکہ اب وہاں ایک نہیں بلکہ میری دو دو محبوبائیں تھیں۔ وہ اپنی بھانجی کی تعریفیں کرتے ہوئے نہ تھکتے تھے۔ نہ جانے ان کے دل میں کیا تھا لیکن میرا دل ڈولنے لگا تھا۔ میری نظریں التفات زیادہ تر اسی کی طرف تھی۔ لیکن رعنا حسن جھٹ میری توجہ اپنی طرف پھیر لیتی۔ کبھی کبھی تو وہ میرا ہاتھ پکڑ لیتی اور میرے پورے جسم میں برقی لہر دوڑ جاتی۔ کبھی میرے ساتھ اوٹنگ پر جانے کی ضد کرتی، کبھی ڈک پر رقص کرنے کا آفر دیتی۔ ادھر نسیم فاطمہ ساتھ بیٹھ کر ایک کپ چائے پینے کی دعوت دیتی۔ وہ باتیں بہت بہت اچھی کرتی تھی۔ اپنے ماموں کی طرح اس کے پاس بھی دلچسپ باتوں کا ذخیرہ تھا۔ اور میں فٹ بال کی طرح لڑھک کر کبھی ادھر جاتا اور کبھی ادھر۔ میری جان عذاب میں تھی۔ دو بلائیں مجھ سے چمٹ گئی تھیں۔ اور میرا حال یہ تھا کہ نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن۔

سہانا موسم اور یہ موسم حسین

ایک دن ایک عجیب واقعہ رونما ہو گیا۔ ایم ڈی صاحب کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ میری جو شامت آئی تو میں ان کے بنگلہ پر پہنچ گیا۔ شام ہو رہی تھی۔ مالی پودوں میں پانی ڈال رہا تھا۔ نسیم پاس کھڑی کچھ ہدایتیں دے رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کا چہرہ کھل اٹھا۔

''آیئے یوسف صاحب بڑے وقت پر پہنچے ہیں۔ میں اس شام کی تنہائی میں بور ہو رہی تھی۔'' وہ مجھے اپنے ساتھ ڈرائنگ روم میں لے آئی۔ اندر سے تیز میوزک آواز آ رہی تھی۔ چند رسمی گفتگو کے بعد میں نے پوچھا۔

''رعنا حسن کہاں ہے؟''

''یہ میوزک کی آواز آپ نہیں سن رہے ہیں؟ وہ اپنے چند بگڑے ہوئے دوستوں کے ساتھ رنگ رلیا منا رہی ہے۔''

''تم لوگ اس بے راہ روی کے لیے اسے منع کیوں نہیں کرتیں۔''

''وہ کسی کی سنتی کب ہے۔ یہاں تک کہ ماموں جان کی بھی نہیں سنتی اور مجھے تو وہ اپنی جوتی کے برابر بھی نہیں سمجھتی۔''

اسی وقت رعنا نوکروں کی تلاش میں وہاں پہنچ گئی وہ ہماری گفتگو کا کچھ حصہ سن کر آگ بگولہ ہو گئی۔

''ذلیل احسان فراموش میرے ٹکروں پر پل رہی ہے اور میرے ہی خلاف زہر اگل رہی ہے۔ یہ نہ بھولنا کہ میرے ایک اشارے پر تیرا پتہ کٹ سکتا ہے اور خبردار جو میری پسند کی ہوئی چیز کو چھیننے کی کوشش کی۔ جو چیز مجھے پسند آ جاتی ہے اسے حاصل کر کے ہی رہتی ہوں۔ کوئی چیز میری دسترس سے باہر نہیں ہے۔ پیسے میں بڑی طاقت ہے۔ سمجھی!''

رعنا حسن نے تفاخر سے کہا۔

''اس خوش فہمی میں نہ رہنا ہر چیز بکنے والی نہیں ہوتی یہ تم بھی جان لو۔''
نسیم کب پیچھے رہنے والی تھی۔

''کمینی کتنی مجھے چیلنج کرتی ہے۔ میں تیرا خون پی جاؤں گی۔''

اب نسیم کی چٹیا رعنا کے ہاتھ میں تھی۔ میں گھبرا کر کھڑا ہو گیا اور دونوں کو گھتم گھتا ہونے سے بچاتے بچاتے خود بھی لہولہان ہو گیا۔ اب میری سمجھ میں یہ بات آ گئی تھی کہ لڑکیاں ناخن کیوں بڑھاتی ہیں۔ واقعی یہ بڑے کام کی چیز ہیں۔ خوانخواستہ اگر کبھی وہ کسی مصیبت میں پھنس جائیں تو یہ آڑے وقت کام آ سکتے ہیں اور کچھ نہیں تو کم سے کم اپنے حریف کا منہ نوچنے میں مددگار ثابت ہو سکتے ہیں۔

جب معاملہ رفع دفع ہوا' دونوں کا غصہ ٹھنڈا ہوا تو میں وہاں سے تیزی کے ساتھ بھاگا۔ دل میں دل ہی دل میں یہ کہتا ہوا جان بچی تو لاکھوں پائے خیر سے بدھو گھر کو آئے۔ گھر پہنچ کر میں بچاؤ بچاؤ کی صدا لگاتے ہوئے امی کے پاؤں سے لپٹ گیا۔ چہرہ پسینے سے شرابور ہو رہا تھا۔ امی نے جھٹ جھٹ آنچل سے پسینہ پوچھا۔ آیۃ الکرسی پڑھ پڑھ کر دم کرتی جاتی تھیں۔

'کیا ہوا بیٹا کچھ بتا تو سہی؟''میں نے کہا۔

''امی جلد کوئی انتظام کیجئے ورنہ آپ کے بیٹے کے گلے میں بھی پٹا پڑ جائے گا۔''

احساس کا کرب

یاد ماضی عذاب ہے یارب
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

یہ شعر وہ اکثر گنگناتا رہتا کیونکہ یاد ماضی کے عذاب سے وہ اب تک نجات حاصل نہیں کرسکا تھا۔ ماضی جونک کی طرح اب تک اس کے دامن سے لپٹا ہوا تھا۔

اسے کچھ یاد نہیں کہ اس نے اپنی ماں کے سایہ عاطفت میں اپنا وقت کس طرح گزارا تھا۔ جہاں سے اس کی یادوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے وہ ایک منحوس شام تھی۔ شام کے سائے گہرے ہوتے جارہے تھے۔ اب رات اترنے والی تھی۔ ہر سو تاریکی پھیلتی جارہی تھی۔ لیکن اس ماں اب تک واپس نہ آئی تھی۔ راہ تکتے تکتے اس کی آنکھیں پتھرا گئی تھیں۔ ہر آہٹ پر چونک کر وہ چاروں طرف دیکھتا۔ لیکن کچھ بھائی نہیں دیتا۔ البتہ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ بھو کے لمبے لمبے ناخنوں والے ہاتھ اس کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ آس پاس کے درخت کے پتے جب ہوا سے آپس میں ٹکراتے تو ایسا لگتا کہ آسیب

سرگوشیاں کر رہے ہیں۔ اور وہ کسی وقت آکر اسے دبوچ لیں گے۔ ڈر سے اس نے آنکھیں بند کرلیں اور منہہ چھپا کر رونے لگا۔ دیر تک اس کی سسکیاں فضا میں تحلیل ہوتی رہیں۔ پھر ہچکیوں کے درمیان اس کی آنکھیں بند ہوتی چلی گئیں۔

صبح جب آنکھ کھلی تو اس کے گرد بہت سارے لوگ جمع تھے۔ انھیں دیکھ کر وہ بلبلا اٹھا۔

''کیا ہوا ہے؟'' ایک شخص نے پوچھا۔

''ماں!'' وہ صرف اتنا ہی بول سکا۔

''کیا ہوا تیری ماں کو؟ کہاں گئی وہ؟ بول نا؟''

وہ کیا بولتا وہ تو خود ایک ایک کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''کیا ہوا بھائی؟'' کس نے پکار کر پوچھا۔

''اس کی ماں بھاگ گئی۔ اس کی ماں بھاگ گئی۔ اس کی ماں بھاگ گئی۔''

اس کا دماغ شائیں شائیں کرنے لگا۔

کسی نے اس کے آگے چند روٹیاں ڈال دیں جیسے وہ کوئی کتا ہو۔

اس نے چند لقمے کھائے اور پھر رونے لگا۔ وہ رہنے پر آتا تو روتا ہی چلا جاتا اور چپ کا دورہ پڑتا تو مسلسل چپ سادھے رہتا۔ اسی طرح کئی دن، کئی ہفتے، پھر کئی مہینے گزر گئے۔ کسی کو دیا میا آتی تو کچھ کھانے کے لیے دیتا۔ ورنہ کئی کئی وقت فاقے میں گزر جاتے۔ پہلے تو وہ اپنا سدھ بدھ ہی کھو بیٹھا تھا۔ لیکن وقت ایک ایسا مرہم ہے جو ہر زخم کو مندمل کر دیتا ہے۔

اب اسے بھوک ستانے لگی تھی۔ یہ بڑی ظالم شے ہے۔ یہ انسان کو ہر جائز ناجائز کام کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے اس نے بھی ایک دن کسی دوکان سے ڈبل روٹی کا ایک پیکٹ چرا لیا۔ لیکن دوکان دار نے فوراً اسے

پکڑلیااور دو چار جھانپڑ رسید کر دیے۔ پھر روٹی کا پیکٹ اسے پکڑاتے ہوئے کہا۔

''جا کھالے' لیکن آئندہ سے ایسی حرکت نہ کرنا۔''

روٹی کھانے کے بعد اس نے سوچا کیا ہوا' دو چار تھپڑ کے بعد اسے روٹی کھانے کے لیے تو مل گئی۔ اسکی ہمت بڑھ گئی۔ وہ اکثر کہیں نہ کہیں سے کچھ چرالیتا۔ لیکن یہ اس کی بدقسمتی تھی یا خوش قسمتی کہ ہر بار وہ پکڑا جاتا اور اس کی پٹائی ہوتی۔ ایک دن کسی بڑی چیز چرانے کے پاداش میں اس کی اتنی پٹائی ہوئی کہ کئی روز تک وہ بستر سے اٹھ نہ سکا۔ تب اس نے کان پکڑ کر توبہ کی۔ اب وہ بوجھا ڈھو کر اپنا پیٹ پالتا۔ اس کام میں کبھی کبھی لڑکھڑا کر گرنے سے وہ زخمی ہوتا سو ہوتا' اس کے لیے اسے جھڑکیاں اور مار بھی کھانی پڑتی۔

بہت ہی کم لوگ ایسے تھے جو اس سے پیار سے باتیں کرتے۔ زیادہ تر لوگ اسے حقارت سے دیکھتے اکثر لوگ کہتے۔

''وہ دیکھو حرامی پلا جا رہا ہے۔'' یہ ضرب اتنی کاری ہوتی جو اسے توڑ پھوڑ کر رکھ دیتی۔ اسے اپنا وجود کرچی کرچی ہوتا ہوا محسوس ہوتا۔ لیکن دھیرے دھیرے اس نے حالات سے سمجھوتہ کرنا سیکھ لیا۔

اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ ایسا کیوں کہتے ہیں۔ اس کے باپ کے بارے میں یہاں کسی کو کوئی علم نہ تھا۔ لیکن اس کی ماں کو سب ہی جانتے تھے' جو محنت مزدوری کر کے شرافت سے اپنا وقت گزار رہی تھی۔ پھر بھی لوگ کہتے ہیں۔

''اس کی ماں بھاگ گئی' اس کی ماں بھاگ گئی۔'' اس سانحہ کو عرصہ گزر چکا تھا' لیکن اس آواز کی بازگشت اب بھی اس کے کانوں میں گونجتی۔ کبھی کبھی گھبرا کر وہ اپنی دونوں ہتھیلیوں سے اپنے دونوں کان بند کر لیتا۔

''نہیں نہیں کوئی ماں اپنے بچے پر ایسا ظلم نہیں کرسکتی۔ اس کے پاس تو ممتا کا

بیش بہا اور انمول خزانہ ہوتا ہے، جسے وہ اپنے بچوں پر شب و روز نچھاور کرتی رہتی ہے۔ پھر وہ اسے بیچ منجدھار میں کیسے چھوڑ سکتی ہے۔ ضرور وہ کسی کی درندگی کا شکار ہوئی ہوگی۔ تبھی تو اس کی روح بے چین ہے۔ وہ اکثر اس کے خواب میں آتی ہے اور پوچھتی ہے۔

''تو ٹھیک تو ہے بیٹا۔ تجھے کوئی تکلیف تو نہیں؟''

اسے یاد نہیں کہ اس کی ماں اسے کس نام سے پکارتی تھی۔ لیکن اب اسے لوگ اللہ رکھا کہتے تھے۔ جب وہ تھوڑا بڑا ہوا تو اسے اس نام سے چڑھ ہونے لگی۔

''بھلا یہ بھی کوئی نام ہوا؟ اللہ رکھا۔ اللہ رکھا تو ہر انسان ہوتا ہے۔ جو بڑے بڑے محلوں میں رہتا ہے اسے بھی اللہ ہی رکھتا ہے۔ جو بڑی بڑی گاڑیوں میں سیر کرتے ہیں انھیں بھی اللہ ہی رکھتا ہے ورنہ چشم زدن میں ان کی ہڈی پسلی سرمہ نہ بن جاتی۔ جو زمین کے اندر کیڑے مکوڑے رہتے ہیں انھیں بھی اللہ ہی رکھتا ہے۔ زمین کے اندر ہی ان کی خوراک فراہم کرتا ہے۔

اس نے اپنا نام بدل کر عبداللہ رکھا۔ عبداللہ یعنی اللہ کا بندہ۔ اس نام کا مطلب اسے مدرسے کے مولوی صاحب نے بتایا تھا۔ جہاں وہ پڑھنے کے لیے جایا کرتا تھا۔

اس نے سوچا وہ بھی اور بندوں کی طرح اللہ کا ایک بندہ ہے۔ اسے بھی سر اونچا کر کے جینے کا حق حاصل ہے۔ اسے بھی اپنی زندگی کو کامیاب بنانے کا حق ہے، لیکن یہاں لوگ اسے سر اٹھا کر جینے نہیں دیں گے۔

اس نے یہ جگہ چھوڑ دینے کا ارادہ کرلیا۔ پھر بہت جلد اپنے ارادے میں کامیاب ہوگیا۔ دوسری جگہ اس نے بہت جلد اپنے قدم جمالیے۔ پہلے سے تھوڑا بہت پڑھنا لکھنا سیکھ چکا تھا۔ اب محنت مزدوری کے ساتھ ساتھ باضابطہ پڑھائی شروع کردی۔ وہ مطمئن تھا کہ اس شہر میں اسے کوئی پہچاننے والا نہیں ہے۔ اس کے ماضی سے کوئی واقف نہیں ہے۔ لیکن ایک دن وہ اسکول کے گیٹ سے نکل رہا تھا کہ پیچھے سے کسی

نے آواز دی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔

"ارے اللہ رکھا تو یہاں کیا کر رہا ہے؟"

"ظاہر ہے اسکول پڑھنے کے لیے ہی آیا ہوں۔"

"ارے پڑھ کر کیا کرے گا۔ کتنے مزے میں اپنے قصبے میں تھا۔ بڑے ہونے پر کہیں نہ کہیں سیٹ ہو ہی جاتا۔ خیر جیسی تری مرضی میرے بیٹے کی نوکری یہیں لگی ہے۔ چل تجھے اس سے ملادوں۔"

"نہیں ماما رہنے دو میں یہاں مزے میں ہوں۔"

اس دن وہ بے چین رہا۔ ساری رات ایک منٹ کے لیے بھی نہ سو سکا۔ یہی سوچتا رہا کہ اب وہ کہاں جائے جہاں کوئی اسے اللہ رکھا پکارنے والا نہ ہو۔

میٹرک پاس کرنے کے بعد اس نے یہ جگہ بھی چھوڑ دی۔ دوسرے شہر جا کر اس نے آئی ٹی ٹی کا کورس کیا۔ پھر ایک پاور ہاؤس میں اسے ٹکنیشین کی جاب مل گئی۔ رہنے کے لیے ایک روم کا کواٹر بھی ملا۔ اس روز وہ بے حد خوش تھا۔ آخر اللہ اس پر مہربان ہو ہی گیا۔ اس کے بہت سارے دوست احباب پیدا ہو گئے۔

وہ جوان تھا خوبصورت تھا اور برسر روزگار تھا۔ ہر کوئی اسے اپنی فرزندی میں لینے کا خواہاں تھا۔ اس کے لیے شادی کا پیغام آیا تھا کچھ لوگ اسے دیکھنے بھی آئے۔ ان میں سے ایک نے اسے پہچان لیا۔

"ارے اللہ رکھا تو۔"

پھر وہ اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر یوں گویا ہوا۔

"ارے بھائی! کیا بتاؤں اس نے کیا کیا مصیبتیں جھیلی ہیں۔ مگر بڑا ہی ہونہار بچہ ہے۔ آخر اپنا مقام بنا ہی لیا۔ جب اتنا سا تھا (اس نے ہاتھ کے اشارے سے بتایا۔) تب اس کی ماں اسے چھوڑ کر بھاگ گئی تھی۔"

اور اس کے سر پر بم پھٹ گیا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگا۔

''کیا لوگ اس سانحہ کو بھول نہیں سکتے ؟ بھرتے ہوئے زخم کے ٹانکے ادھیڑ نے میں انھیں کیا مزہ آتا ہے؟؟''

''یا خدا تیری اتنی بڑی دنیا میں کوئی تو ایسی پناہ گاہ ہوگی جہاں کوئی مجھے میری ماں کے حوالے سے رسوانہ کر سکے؟''

یہ کراہ اس کے اندر سے اٹھ کر پورے وجود میں پھیل گی۔

☆☆☆

منو

ابھی حالات پوری طرح قابو میں نہیں آئے تھے۔چھٹ پٹ وارداتوں کی خبریں آ رہی تھیں۔ایک طوفان آ کر گزر گیا تھا لیکن ابھی بھی فضا میں ہر سو سوگواری اور اداسی چھائی ہوئی تھی۔لوگ ڈرے سہمے گھروں میں دبکے ہوئے تھے۔گھروں سے نکلنا خطرے سے خالی نہ تھا' خاص کر دور دراز اور ٹرین کا سفر کرنا گویا اپنی موت کو دعوت دینا تھا۔

میرے ایک دوست کی شادی ہونے والی تھی اور اس تقریب میں میری شرکت ضروری تھی۔اب صرف چند ہی دن باقی رہ گئے تھے اور میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہوتا جا رہا تھا۔بالآخر میں سر سے کفن باندھ کر نکل ہی پڑا۔حالات کی ناسازگاری کی وجہ سے بھیڑ بہت ہی کم تھی۔مجھے آسانی سے رزرویشن مل گیا۔کمپارٹمنٹ میں بھی گنے چنے آدمی تھے۔میرے سامنے والی برتھ پر ایک صاحب براجمان تھے جو آرام سے پاؤں پسارے نیم دراز اخبار کے مطالعہ میں غرق تھے۔میں نے بھی اپنی برتھ سنبھالی اور وقت

گزاری کے لیے ایک میگزین اُٹھالیا' لیکن دہشت کے مارے پڑھنے میں دل نہ لگا تو میں کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ باہر ہو کا عالم اور خوفناک اندھیرا تھا' جیسے کالی فضا میں کالی چادر تان دی گئی ہو۔ چھوٹے چھوٹے اسٹیشنوں پر کہیں کہیں لیمپ کی ٹمٹماتی ہوئی روشنی نظر آجاتی اور چونکہ رات زیادہ نہیں گزری تھی اس لیے اکا دکا آدمی بھی دکھائی دے جاتے جنھیں دیکھ کر ہیبت سی محسوس ہونے لگتی۔ کیا وقت آ گیا ہے۔ یہی انسان جو کبھی ایک دوسرے کا محافظ' خیر خواہ' ہمدرد اور غم گسار ہوا کرتا تھا' آج درندوں سے زیادہ خوفناک اور خطرناک ثابت ہو رہا ہے۔ میں نے جھٹ کھڑکی بند کر دی اور پھر میگزین اُٹھالیا۔ سامنے کی برتھ والا شخص ہنوز مطالعہ میں مشغول تھا۔ گاہے گاہے میں میگزین کو تھوڑا نیچے کھسکا کر دزدیدہ نگاہوں سے اطراف کا جائزہ لیتا تو مجھے ایسا لگتا کہ وہ شخص مجھے عجیب نظروں سے گھور رہا ہے۔ میرے پورے جسم میں خوف کی لہر دوڑ جاتی اور دل خزاں رسیدہ پتے کی طرح ڈولنے لگتا۔

کچھ دیر بعد وہ شخص اخبار کو رکھ کر کھڑکی سے ٹیک لگا کر سوچنے والے انداز میں بیٹھ گیا۔ اپنے خوف پر قابو پاتے ہوئے میں نے اسے مخاطب کر کے کہا۔

''بھائی صاحب ذرا پیپر دیں گے۔ دیکھوں تو آج کیا خبر ہے۔''

اس نے پیپر بڑھاتے ہوئے کہا۔

''کیا خبر ہو سکتی ہے۔ وہی گھسی پٹی خبریں۔ نیتاؤں کے اپنے دکھڑے۔ آپس کی لڑائیاں۔ اپنا پرابلم۔ دیش اور دیش واسی تو بھگوان ہی بھروسے ہیں۔''

اس کی گفتگو سے اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ کون ہے۔ میرے دل میں خوف کنڈلی مار کر بیٹھ گیا۔ کیا پتہ یہ ''وہی'' ہو۔

''آپ کو کیا لگتا ہے' اس بار کون پارٹی ستا میں آئے گی؟''

''کوئی بھی آئے۔ کیا فرق پڑتا ہے۔ ہم جہاں ہیں وہیں رہیں گے۔ جو بھی

آئے گا اپنی تجوری بھرے گا۔ غریبوں کا خون چوسے گا۔ ہمیں بے وقوف بنا کر دنگا فساد کرائے گا۔''

دنگا کے نام پر میں نے ایک جھرجھری لی اور باتوں کا رخ پھیرنے کے لیے پوچھ بیٹھا۔

''آپ کہاں جا رہے ہیں؟''

''جمشید پور۔'' اس نے مختصر سا جواب دیا۔

''عجیب اتفاق ہے۔ میں بھی جمشید پور جا رہا ہوں۔ اچھا ہے پورے سفر میں ساتھ رہے گا۔''

یہ سب میں اوپری دل سے کہہ رہا تھا ورنہ اندر ہی اندر میں خوف زدہ تھا۔ نہ جانے کس مذہب سے تعلق رکھتا ہے۔ کس قسم کا آدمی ہے۔ ابھی تک اس کے سامان اور وضع قطع سے کچھ پتہ نہیں چل رہا ہے۔ ہمت کر کے میں نے پوچھا۔

''آپ کا نام؟''

''منو..... اور آپ کا؟''

''ببلو۔'' میں نے دانستہ اپنا اصلی نام چھپا لیا کیونکہ یہی نام تو.....

وہ شخص گھوم پھر کر پھر اسی موضوع پر آ گیا۔ اس نے بولنا شروع کیا۔

''یہ زمانے بھر کی بدعنوانیاں جو ہر طرف پھیلی ہوئی ہیں' یہ ہمیں کس پستی میں لے جائیں گی' اس کا اندازہ ہے ہمیں؟ یہ کس نے سوچا ہے؟ ویسے تو بھاشنوں میں بڑی اونچی اونچی باتیں سننے کو ملتی ہیں۔ ہمیں بھید بھاؤ ختم کر کے اہنسا کے راستے پر چلنا چاہیے کیونکہ ایکتا میں وہ طاقت ہے کہ ہم پوری دنیا فتح کر سکتے ہیں۔ ہم سب ایک ہیں۔ ہمارا خون ایک ہے۔ لیکن نہ جانے کب اور کیسے یہ خون جس کا رنگ لال ہے' سفید ہو کر مذہب کے نام پر نفرتوں کے پودوں کی آبیاری کرنے لگتا ہے۔ دلوں میں نفرت کے بیج بو

کر انسانیت کی کھیتی کو پامال کرتا ہے۔ غنڈوں کو کھلی چھوٹ دیتا ہے اور یہ قانون کے رکھوالے بیٹھ کر تماشا دیکھتے ہیں۔ یہ نوجوان جو سروں پر پگڑ باندھے' ہاتھوں میں بھالا گڑاسہ لیے نعرے بازیاں کرتے ہیں' انقلاب زندہ باد کے نعرے لگاتے ہیں' وہ نہ جانے کس انقلاب کی باتیں کرتے ہیں۔ عبادت گاہوں کو مسمار کرتے ہیں۔ انسانیت کا خون کرتے ہیں۔ کیا یہی انقلاب ہے؟ انھوں نے کبھی یہ سوچا ہے کہ کسی کی لاش پر سے گزر کر مسجد یا مندر تعمیر کرنے سے نہ خدا خوش ہوگا نہ بھگوان۔ لیکن یہ عقل سے نہیں' جذبات سے کام لیتے ہیں اور جذبات تو انسان کے ہوش و حواس چھین لیتے ہیں۔ یہ خود اپنے دل و دماغ کو زخمی کرتے ہیں۔ اپنے پاؤں پر خود کلہاڑی مارتے ہیں۔''

وہ لگاتار بول رہا تھا۔ جوش میں اس کی آواز اس قدر اونچی ہوگئی تھی کہ میں اندر ہی اندر لرز رہا تھا کہ ابھی ہوا گرم ہے۔ دبی ہوئی چنگاری کو بھڑکنے میں کتنی دیر لگے گی لیکن اس کی باتوں سے مجھے تھوڑی تسلی بھی ملی۔ کم از کم اس شخص سے مجھے خطرہ لاحق نہ تھا۔ میں سکون سے سو گیا۔

جب آنکھ کھلی تو میری منزل آچکی تھی۔ سامنے والی برتھ خالی تھی۔ میں نے بھی اپنا بوریا بستر سنبھالا اور کمپارٹمنٹ سے اتر گیا۔

اپنے دوست کی شادی کی تقریب میں وہاں پہنچا تو وہ ٹرین والا شخص پہلے سے وہاں موجود تھا۔ معلوم ہوا کہ اس کا نام منور ہے اور وہ بھی شادی میں شرکت کے لیے آیا ہے۔ میں اس سے بے اختیار لپٹ گیا اور سوچنے لگا کہ حالات نے انسان کو اس قدر خوف زدہ اور بزدل کر دیا ہے کہ وہ اپنی پرچھائیں سے بھی ڈرنے لگا ہے۔

☆☆☆

آخری موڑ پر

بڑھاپا خود ایک مرض ہے.....اور وہ بھی لاعلاج.

وہ اس مرض کا شکار ہو چکی تھیں۔ بڑھاپے کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی جوڑوں اور گھٹنوں کے درد نے آدبوچا تھا' اور اب تو کمر کے درد نے بھی رہی سہی کسر نکال دی تھی۔ اُٹھنا' بیٹھنا' چلنا' پھرنا محال ہو گیا تھا۔ زیادہ پریشان کن بات یہ تھی کہ اس زمانے میں نوکروں کا کال پڑا ہوا ہے۔ اگر وہ مل بھی جاتے ہیں تو ان کا قد مالک سے بالشت بھر اونچا ہی ہوتا ہے۔ ہزار نخرے سہنے پڑتے ہیں۔ جتنا طے ہوتا ہے' کیا مجال کہ اس سے ایک کام بھی فاضل کر دیں۔ بھلے ہی ایک گھنٹہ لیٹ آئیں لیکن پانچ منٹ زیادہ نہیں رک سکتے۔ اس پر طرہ یہ کہ ہر کچھ دنوں کے بعد انھیں چھٹی چاہیے۔ نئی نوکرانی جسے آئے ہوئے مشکل سے ایک ماہ ہوا ہوگا' آج پھر چھٹی کا مطالبہ کر بیٹھی۔

''بی بی جی! مجھے ایک ہفتہ کی چھٹی چاہیے۔''

''کیوں؟ ارے کچھ ہی دن قبل تو تو نے چار دن کی چھٹی لی تھی۔''

''کیا کریں بی بی جی! میرا مرد کل کام پر گیا تو نہ جانے کیسے پھسل کر گر گیا اور اپنی ٹانگ توڑ ڈالی۔ کل اسے ڈاکٹر کے پاس لے گئی تھی۔ آج پلاسٹر کے لیے جانا ہے۔ پھر کم سے کم ایک ہفتہ تو اس کی دیکھ بھال کرنا ضروری ہے۔ آخر وہ میرا مرد ہے۔ بھر پیٹ کھلائے یا آدھا پیٹ۔ اس کی سیوا کرنا اپنا فرض ہے۔''

شوہر کی پکار پر وہ گھٹنا پکڑ کر اُٹھتی ہوئی بولیں۔

''جا بھئی جا! تو اپنا فرض نبھا' میں چلی اپنا فرض نبھانے۔''

سنا ہے کہ جو عورت اس حال میں مر جائے کہ اس کا شوہر اس سے راضی اور خوش ہو تو سمجھو اسے جنت مل گئی۔ تو کیوں نہ ہم اپنی جنت بنائیں۔ اب کسے کیا ملے گا' یہ تو اوپر والے کے رحم و کرم پر منحصر ہے۔ اپنا تو کام بس یہ ہے کہ بھلا کیے جاؤ۔ کچھ یہاں کے لیے' کچھ وہاں کے لیے۔ اگر یہاں کچھ نہ ملا تو چلو یہ امید تو رہے گی کہ شاید وہاں کچھ صلہ مل جائے۔ اگر سب کچھ دنیا ہی میں مل جائے تو جنت کی آرزو کون کرے؟

ویسے دنیا میں بھی خدا نے اُنھیں بہت نوازا تھا۔ اوپر تلے چار ہونہار بیٹے عطا کیے تھے۔ چار پیاری پیاری بہوئیں آئی تھیں۔ بڑے بیٹا اور بہو تو امریکہ جا بسے۔ منجھلی بہو بیٹے کو لے کر ایسی الگ ہوئیں کہ کبھی موقع بے موقع بھی آنے کی توفیق نہ ہوتی۔ تیسری والی بہت احسان کرتی تو پرب تہوار پر آجاتی' لیکن بالکل مہمان بنی رہتی۔ چھوٹی بہو خیر سے پاس ہی تھی' لیکن اس کے پاؤں میں گھن چکر لگا ہوا تھا۔ گھر میں ٹکتی ہی نہیں تھی۔ کبھی مارکیٹ' کبھی بیوٹی پارلر' کبھی سکھی سہیلیوں کے یہاں تو کبھی میکے۔ کوئی آئے کوئی جائے' اسکی بلا سے۔ کبھی کبھی تو بچے کو بھی ساس کے حوالے کر دیتی' اور وہ چپ چاپ ساری ذمہ داریوں کو نبھاتی رہتیں۔

ایک دن سویرے سویرے دھوبی کپڑے لے کر آ گیا۔ اسی وقت چند مہمان بھی آ گئے۔ چھوٹی بہو کو آواز دی۔

''بیٹی ذرا دھوبی کو میلے کپڑے دے دو اور اس حساب کر دو۔''

''لیکن ابھی تو مجھے فرصت نہیں ہے۔ مہیلا ادیوگ کی میٹنگ میں فوراً جانا ہے۔''

موقع کی نزاکت دیکھ کر انھوں نے کہا۔

''جاؤ بیٹی جاؤ۔ اپنا کام حرج مت کرو۔''

ایک روز کی بات ہے کہ چھوٹے بیٹے کے آفس جانے کا وقت ہو گیا تھا۔ کھانا تیار ہونے میں کچھ تاخیر ہو گئی تھی۔۔ بہو کا پارہ چڑھ گیا۔

''صبح کے وقت سینکڑوں کام ہوتے ہیں۔ بیٹی ذرا تم بھی دیکھ لیا کرو۔''

''امی! آپ بھی کمال کرتی ہیں۔ جیسے مجھے کوئی اور کام ہے ہی نہیں۔'' بہو نے تیوریاں چڑھا کر کہا۔ وہ منہہ دیکھتی رہ گئیں۔ کیسا زمانہ آگیا ہے۔ ان کے کانوں میں اپنی ساس مرحومہ کی آواز گونجنے لگی۔

''بہو! میں ذرا پڑوس میں جا رہی ہوں، ذرا باورچی خانہ سنبھال لینا۔''

''جی اماں!'' اب سر میں درد ہو یا پیٹ میں، چاہے بخار سے تپ ہی کیوں نہ رہی ہوں، ساس کے حکم کی تعمیل کرنا فرض اولیں تھا۔ اور یہ ایک روز کی بات نہ تھی، روز ہی کا معمول تھا۔ خاندان میں خوشی ہو یا غمی، ان کی شرکت ضروری تھی۔ اس طرح ساس کی زندگی ہی میں ان کے کاندھوں پر کئی ذمہ داریاں آ گئی تھیں۔ میکے کو تو جیسے وہ بھول ہی گئی تھیں۔ اتنے جنجال تھے کہ میکے کی صرف یاد ہی باقی رہ گئی تھی۔ ان کی دوڑ بس گھر تک ہی محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ پھر دھیرے دھیرے عادت سی ہو گئی۔ کبھی گھر کے کاموں میں اگر کمی واقع ہو جاتی تو بیکاری سے گھبرا جاتیں۔ ڈھونڈ ڈھونڈ کر کوئی نہ کوئی مشغلہ نکال لاتیں۔ کبھی رشتہ داروں کے بچوں کے کپڑے سی رہی ہیں، تو کبھی بلاوجہ صفائی میں جٹی ہوئی ہیں۔ اب تو دو سال ہوئے شوہر بھی ریٹائر ہو چکے ہیں۔ اب ان کی ڈیوٹی ڈبل ہو گئی تھی۔ شوہر کی ایک آواز پر بلا تاخیر دوڑ جاتیں۔

''بیگم! ذرا ادھر تو آنا۔ دیکھو میری دوا کہاں ہے۔ مجھے دے دینا۔''

''بیگم! میرے کپڑے پریس کروا دینا۔ کل مجھے باہر جانا ہے۔''

''بیگم! شام کو میرے چند دوست آرہے ہیں۔ ذرا تگڑے قسم کے ناشتہ کا انتظام کر دینا۔''

''بیگم' یہ کرنا۔ بیگم' وہ کرنا۔'' اور بیگم کسی روبوٹ کی طرح شوہر کے ایک اشارے پر ناچتی رہتیں۔ ناچتے ناچتے پاؤں شل ہو چکے تھے۔ زندگی کی لمبی مسافت طے کرتے کرتے وہ تھک کر چور ہو گئی تھیں۔ اعصاب جواب دے رہے تھے۔ ساری توانائی چھن چکی تھی۔ پھر بھی وہ اپنے فرائض بحسن وخوبی انجام دے رہی تھیں۔ ان کی کارکردگی قابل ستائش تھی۔ لیکن نہ جانے کہاں کون سی کسر رہ گئی تھی کہ ان کی طویل خدمات کو خراج تحسین دینے والا کوئی نہ تھا۔ کہتے ہیں کہ انسان اپنی وقعت آپ بناتا ہے۔ اپنے اچھے برے' آرام تکلیف کا وہ خود ذمہ دار ہوتا ہے۔ یہی بات ان کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی کہ اتنی قربانی وایثار کے باوجود کہاں پر ان سے بھول ہو گئی تھی۔ زیادہ کامیاب تو وہ رہیں جنھوں نے نہایت خوبصورتی کے ساتھ اپنے فرائض انھیں سونپ دیے تھے۔ اب تو جوڑوں کے درد کے ساتھ ہلکی ہلکی حرارت بھی رہنے لگی تھی۔ اگر وہ کسی جاب میں ہوتیں تو بہت قبل ریٹائرمنٹ لے چکی ہوتیں۔ لیکن یہ تو ہاؤس جاب تھی جہاں نہ کوئی ریٹائرمنٹ ہے نہ انکریمنٹ۔

اس روز تکلیف کچھ زیادہ بڑھی ہوئی تھی۔ وہ لیٹ کر کراہنے لگیں۔ اسی وقت شوہر کی پرجوش آواز آئی۔

''اجی سنتی ہو۔ دیکھو تو کون آیا ہے۔'' پھر دور ہی سے اطلاع دی۔

''آج بہت دنوں بعد بھیا بھابھی آئے ہیں۔''

اور وہ کراہتے ہوئے سوچ رہی تھیں۔

''لگتا ہے اب مجھے مرنے کے بعد ہی ریٹائرمنٹ ملے گی۔''

☆☆☆

آرزو کے قدم

جب ستر برس کی بڑھیا آئینے میں خود کو نہارنے لگے تو سمجھو دماغ میں کوئی خلل پیدا ہو گیا ہے۔ اس کے دماغ میں بھی کچھ ایسا ہی خلل آ گیا تھا۔ وہ زاویہ بدل بدل کر گھنٹوں آئینہ کے سامنے کھڑی رہتی اور زیر لب کچھ بڑبڑاتی رہتی۔ اس کی باتیں ناقابل فہم ہوتیں۔ ممکن ہے کسی زمانے میں اس کا سراپا پرکشش اور چہرہ خوبصورت رہا ہوگا لیکن اب تو وہ ایک بیڈول جسم اور بے رونق چہرے کی مالکہ تھی۔ اور یہی اس کے دکھ کا سبب تھا۔ وقت نے اس کے ساتھ بڑی ناانصافی کی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کے قدموں کے نیچے سے کھسک گیا اور اسے خبر تک نہ ہوئی۔ لیکن آئینہ نے اسے دھوکے میں نہیں رکھا۔ سب کچھ سچ سچ بتا دیا۔ وہ سچ جو بہت ہی کڑوا تھا۔ رخسار کی ڈھلکتی ہوئی جلد، آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے اور بالوں میں جھلملاتے ہوئے چاندی کے تار اسے یقین دلا رہے تھے کہ اب کوئی لباس، کوئی سنگھار اسے زیب نہیں دے گا۔

"تو پھر وہ کیا کرے ان چیزوں کا جو اسے اب میسر ہیں، اب ان کا کیا کام؟"

''دے دو کسی ضرورت مند کو، تقسیم کر دو غریبوں میں۔''

''نہیں، نہیں!'' وہ چیخ اُٹھی۔

وہ دن میں ایک بار ضرور اپنی الماری کھولتی۔ ایک ایک کپڑا نکالتی۔ پیار سے ان پر ہاتھ پھیرتی۔ پھر نئے سرے سے تہہ کر کے، سنبھال کر، بڑی آہستگی کے ساتھ اُنھیں رکھتی، جیسے وہ نومولود بچے ہوں۔ زیور اور چوڑیوں کو پر شوق نگاہوں سے دیکھتی اور پھر اُنھیں لاکر میں بند کر دیتی۔ اپنے کمرے میں ریک پر قطار سے رکھی ہوئی چپلوں کو دیکھ کر اسے اپنی وہ ٹوٹی ہوئی چپل یاد آجاتی جسے اس نے اتنی بار موچی سے سلوایا تھا کہ اس میں مزید سلائی کی گنجائش نہیں رہی تھی۔ جب نئی چپل خریدنے کے بارے میں سوچتی تو بچوں کے اسکول کی فیس، ماسٹر کا مشاہرہ، دودھ اور سبزی کا بقایا اور اس طرح کی بہت ساری چیزوں کی فہرست اس کے خیالوں میں آجاتی۔

جب اس نے اپنی ازدواجی زندگی کا سفر شروع کیا تھا تو بہت ساری آرزوئیں، اُمنگیں، شوہر کی چاہتیں اور اس کا اعتماد ساتھ لے کر چلی تھی۔ لیکن ان چاہتوں نے ضرورتوں کے بوجھ تلے دب کر بہت جلد دم توڑ دیا تھا اور اب اس گھٹے گھٹے ماحول میں وہ بس ایک مشین بن کر رہ گئی تھی جو بلا احتجاج اپنا کام انجام دیتی رہتی ہے۔ نہ اسے بھوک لگتی نہ پیاس۔ نہ اسے اچھی پوشاک کی طلب ہوتی نہ اچھی خوراک کی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کے شوہر نے اسے ٹوٹ کر چاہا تھا۔ لیکن زندگی کچھ اور بھی مانگتی ہے۔ وہ مافوق الفطری قسم کی کوئی شے نہیں تھی۔ گوشت پوست کی جیتی جاگتی انسان تھی، جس کے سینے میں دل اور دل میں جذبات ہوتے ہیں۔ اس بات کو اس کے شوہر نے یکسر نظر انداز کر دیا تھا۔ جو آرزو والاؤ کی طرح اس کے سینے میں دہکتی رہتی اس کی تپش اس کے شوہر تک شاید نہیں پہنچ پاتی تھی۔ کاش! وہ اس کے جسم پر جھولتے ہوئے بد رنگ اور بد زیب لباس، سونی کلائیاں اور خالی گلے کو دیکھ سکتا۔ اس کے چہرے پر لکھی

ہوئی تحریر اور آنکھوں میں اُٹھتے ہوئے سوال کو پڑھ سکتا۔ کیا یہ ساعتیں، یہ لمحات پھر لوٹ کر آئیں گے؟ لیکن وہ خاموش نگاہوں کی زبان پڑھنے سے قاصر تھا۔ حالات کے شکنجے میں جکڑی ہوئیں اس کی شخصیت مسخ ہوتی جا رہی تھی۔ لیکن کیا حالات صرف تقدیر کی مُٹھی میں ہوتے ہیں؟ یہ سوال وہ بار بار اپنے آپ سے کرتی۔ تصور میں بارہا کتنے مناظر اُبھرتے اور ڈوبتے۔ اس کے جذبات بار بار مجروح ہوتے رہے۔

اب تو شوہر کو گزرے ہوئے بھی ایک عرصہ گزر گیا۔

کسی تقریب میں شرکت کی چاہ، کسی روح افزا مقام پر جانے کی آرزو، زندگی کے سفر میں تھوڑی سی تبدیلی، تھوڑی سی تفریح کی تمنا۔ بنی ٹھنی پڑوسن کے لہراتے آنچل سے اُٹھتی ہوئی بھینی بھینی خوشبو دل میں ہلچل مچا کر ایک نئی آرزو کو جگاتی۔ فراٹے بھرتی ہوئی چمچماتی گاڑیوں پر بیٹھی ہوئی عورتوں کے ہنستے مسکراتے چہرے ایک اور خواہش کو جنم دیتے۔ یہ سارے جذبے دبے کچلے اندر کہیں پڑے رہتے۔ لیکن اس وقت ایک ضدی بچے کی طرح مچل جاتے جب کوئی نئی آرزو بیدار ہوتی۔ کبھی کبھی وہ سوچتی، زندگی صرف خواہشوں کی تکمیل کا نام نہیں۔

ع.....اور بھی غم ہیں زمانے میں ''تمنا'' کے سوا

لیکن یہ کیفیت دیر پا نہیں ہوتی۔ دل مچل مچک کر کہتا، زندگی بار بار نہیں ملتی۔ اس آواز کی بازگشت مسلسل اس کا پیچھا کرتی رہی۔ یہاں تک کہ وہ سارے ماہ و سال گزر گئے۔ وقت کہاں رکتا ہے؟ وہ کسی کا انتظار نہیں کرتا۔ ہر حال میں گزر جاتا ہے۔ وقت اس کے قدموں کے نیچے سے بھی بڑی آہستگی کے ساتھ نکل گیا۔

بچے غیر ممالک میں جا کر بس گئے۔

جب کبھی آتے ڈھیر سارے تحائف لاتے۔ اور پھر ہر ماہ موٹی رقم کا ڈرافٹ۔

اب وہ ان چیزوں کا کیا کرے؟

وقت گزر گیا۔

جوانی گزر گئی۔

حسن ختم ہو گیا۔

لیکن آرزو کے قدم اپنی جگہ پر جمے ہوئے تھے۔

وہ پھر آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی اور نئی پوشاک زیب تن کر خود کو نہارنے لگی۔

☆☆☆

ادھوری عورت

کئی ہفتوں تک سڑکوں کی دھول پھانکنے کے بعد کہیں جا کر مجھے ایک کمرہ کرایہ پر ملا تھا۔ میری مکان مالکن بڑی ہی سخت گیر تھیں، وہ بیچلر کو اپنا مکان کرایہ پر دینے کے حق میں نہ تھیں۔ بیچاری تنہا رہتی تھیں۔ انہیں نہ تو کوئی اولاد تھی اور نہ شوہر۔ شاید اسی لیے احتیاط برتتی تھیں۔ حالانکہ وہ عمر کے اس حصے سے گزر چکی تھیں جہاں خطرہ لاحق ہوتا ہے۔ لیکن غالباً وہ کچھ مردوں کی سانپ والی فطرت سے واقف تھیں۔ جو ڈسنے پر آتا ہے تو نہ بچہ دیکھتا ہے نہ جوان نہ بوڑھا۔ بہرکیف مجھے ایک کمرہ کرایہ پر مل گیا تھا۔ کمرے کی صفائی اور سامانوں کو ترتیب دیتے ہوئے رات کے دس بج چکے تھے۔ محنت کرنے سے کھل کر بھوک لگ رہی تھی۔ لیکن نئی جگہ اتنی رات گئے باہر نکلنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ لہٰذا ایک ڈبے میں پڑے ہوئے چند بسکٹوں پر اکتفا کرنا پڑا اور اب سونے کے لیے بستر پر جا ہی رہا تھا کہ دروازہ پر دستک ہوئی۔ ''کون ہو سکتا ہے یہاں تو میرا کوئی شناسا بھی نہیں۔'' خود کلامی کرتا ہوا آگے بڑھ میں نے دروازہ کھولا۔ سامنے ایک لڑکی

کھانے کی ٹرے لیے ہوئے کھڑی تھی۔ میں سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔اس نے جلد ہی میری حیرانی دور کر دی۔

''اماں بی نے بھیجا ہے۔''

''کون اماں بی؟''

''آپ کی مکان مالکن۔''

''لیکن ان کی تو کوئی اولاد نہیں ہے۔''

''اڑوس پڑوس کے سارے بچے' جوان' بوڑھے' سب انہیں اماں بی کہتے ہیں۔ گویا وہ سارے جگت کی اماں بی ہیں۔'' یہ سب کہتے ہوئے وہ دوپٹہ کا کونا دانتوں میں دبا کر کھی کھی کر رہی تھی۔

''یہ زحمت انہوں نے کیوں کی۔'' میں نے ٹرے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

''یہ تو اب ان ہی سے پوچھنا۔ فی الحال ٹرے تھامئے اور مجھے جانے دیجئے۔''

لڑکی بڑی تیز طرار تھی۔ مگر اس کے ہنسنے کی وجہ میری سمجھ میں نہ آئی۔ دوسری صبح میں ضروریات سے فارغ ہو کر کمرے سے نکلنے والا ہی تھا کہ پھر دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا تو سامنے ایک پروقار ادھیڑ عمر کی خاتون کھڑی تھیں۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ ضرور یہی اماں بی ہوں گی۔

''تشریف لائیے۔'' میں انہیں راستہ دیتے ہوئے کہا۔

''شاید تم کہیں جا رہے ہو۔ میں مخل تو نہیں ہوئی؟''

''دراصل مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔ میرے کچھ شرائط ہیں۔ پہلی شرط یہ کہ تمہیں دس بجے سے پہلے کمرے پر آ جانا ہے۔ دس بجے کے بعد میرا گیٹ نہیں کھلتا ہے۔ دوسری شرط یہ کہ کمرہ پر دوستوں کے ساتھ زیادہ ہلہ غلہ نہیں کرنا ہے۔ زیادہ پانی نہیں بہانا اور صحن میں کپڑا نہیں ڈالنا۔''

''بس یا کچھ اور؟''

''نہیں میرے شرائط کی خلاف ورزی نہ کرنا' تمہارے حق میں بہتر ہوگا۔''

وہ کسی صورت سے اماں بی کہلانے کے لائق نہ تھیں۔ البتہ آپابی ہو سکتی تھیں۔ گو وقت کے بے رحم ہاتھوں نے ان کے سراپا پر اپنی چھاپ چھوڑی تھی۔ متناسب قد و قامت فربہی کی طرف مائل تھا۔ گورا رنگ اور خوبصورت خدوخال کو موسم کے سرد و گرم نے مرجھا دیا تھا۔ باد سموم نے ساری دلکشی چھین لی تھی۔ پھر بھی کھنڈر بتا رہا تھا کہ عمارت بلند تھی۔

میں اماں بی کے شرائط پر عمل پیرا تھا۔ وقت اپنی مخصوص رفتار سے گزر رہا تھا۔ میرا روز کا ایک ہی معمول تھا۔ صبح نو بجے کمرے سے نکل جاتا رات دس بجے سے قبل واپس آ جاتا۔ اتوار کے دن سارا وقت یونہی کمرے میں پڑا رہتا۔ کبھی کبھی اس رات والی لڑکی کسی نہ کسی بہانے آ جاتی۔ وہ بڑی ~~بے باک اور باتونی تھی۔ شاید وہ~~ اماں بی کی دور کی رشتہ دار تھی ایک دن اس نے کہا۔

''اماں بی آپ سے بہت خوش ہیں۔''

''کیوں ایسا کون سا بھلا کام میں نے کیا ہے؟''

''پتہ نہیں ورنہ انہیں تو مردوں سے سخت نفرت ہے۔''

''کیوں؟''

''تفصیل تو میں نہیں جانتی۔ لوگ کہتے ہیں کہ وہ اوائل عمر میں جب ان کے ایک ایک عضو سے حسن جھلکتا تھا' مسکراہٹ میں بجلی اور ہنسی میں جلترنگ تھا تو ایک شخص ان پر مرمٹا۔ لیکن جلد ہی دھوکا دے کر چلا گیا۔''

پھر جب بھی وہ آتی' اماں بی کے دو چار قصے سنا جاتی۔ جو دکھ سے بھرے ہوتے۔ اُف! حالات کی ستائی ہوئی یہ عورتیں۔ عورت جو ہر روپ میں انمول اور قابل قدر ہے جب وہ بیٹی ہوتی ہے تو گھر کی رونق کو چار چاند لگا دیتی ہے۔ والدین کی خدمت

گزار ہوتی ہے۔ ان کی عزت و ناموس کی ردا تھامے رہتی ہے۔ جب کسی کی رفیق حیات بنتی ہے تو اپنے چھوٹے سے گھر کو جنت بنا دیتی ہے۔ شوہر کے دکھ سکھ کی ساتھی۔ اپنا ہر پل اس کے لیے وقف کر دیتی ہے۔ جب ماں بنتی ہے تو اپنی اولاد کے لیے سایہ دار درخت بن جاتی ہے۔ اس کے سکھ چین کے لیے اپنی ہستی کو فنا کر دیتی ہے۔ پھر بھی زمانے کے ہاتھوں برباد اور پامال ہوتی رہتی ہے۔

میں جب سے یہاں آیا تھا اماں بی سے بس چند سرسری سی ملاقات ہوئی تھی۔ عجیب پراسرار سی شخصیت تھی ان کی۔ کبھی تو وہ سخت گیر لگتیں اور کبھی موم کی طرح نرم اور ملائم۔ ان کے حالات جاننے کے لیے میں متجسس تھا۔ لیکن یہ ایک ٹیڑھی کھیر تھی۔ وہاں تک رسائی ناممکن تھی۔ پھر اچانک ایک چمتکار ہو گیا۔ ایک انہوں نے مجھے طلب کیا۔ اس طلبی کی وجہ سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ نہ جانے مجھ سے کون سی غلطی سرزد ہو گئی تھی۔ میں بے حد نروس تھا۔ ''چل بیٹا لگتا ہے۔ آج تیرا پتہ کٹنے والا ہے۔'' میں خود سے مخاطب ہوا ڈرتے ڈرتے میں ان کے کمرے میں داخل ہوا۔

''آپ نے مجھے بلایا ہے؟''

''ہاں۔''

''کوئی خاص بات۔''

''نہیں بس یوں ہی جب تنہائی سے گھبرا جاتی ہوں تو کسی سے چند باتیں کر کے دل کو سکون ملتا ہے۔''

''آپ تنہا کیوں رہتی ہیں۔ آپ کی کیا مجبوری ہے؟''

''مجبوری نہیں بیٹا؟ یہ ایک شراپ ہے۔ کسی کی آہ ہے۔''

''آپ کے شوہر فوت ہو گئے ہیں؟''

''فوت ہوتے تو کوئی دکھ ہی نہ ہوتا۔ ارد گرد دو چار بچے دل کو سکون اور آنکھوں کو

ٹھنڈک پہنچانے کے لیے تو ہوتے۔ اس نے تو مجھے اس نعمت ہی سے محروم کر دیا۔

''کس نے؟''

وہی جو آندھی طوفان کی طرح میری زندگی میں داخل ہوا اور میری خوشیاں' میرا سکون چین سب کچھ اڑا کر لے گیا۔''

''نہ جانے کیسا جادو تھا اس کی آنکھوں میں جن میں ڈوب کر میں اپنی سدھ بدھ سب کھو بیٹھی تھی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ دو بچوں کا باپ ہے۔ لیکن اس وقت کچھ ایسا نشہ تھا کہ اس بات کی میرے نزدیک کوئی اہمیت نہ تھی۔ پھر بہت ساری مخالفتوں کے باوجود میں نے اسے اپنا ہمسفر بنا لیا۔ لیکن یہ سفر بہت ہی مختصر رہا۔

جب یہ انکشاف ہوا کہ میں ماں بننے والی ہوں تو ہر طرف مجھے خوشیاں رقص کرتی ہوئی نظر آئیں۔ اپنے اردگرد ہر وقت بچے کی کلکاریاں سنائی دیتیں۔ ننھی ننھی بانہوں کے لمس کا احساس مجھے سکون بخشتا۔ شاید عورت کی زندگی میں یہ سب سے خوبصورت پر مسرت اور فخر آمیز دور ہوتا ہے جب وہ تخلیق کے دور سے گزرتی ہے۔ جو انسان کی بقا اور زندگی کے تسلسل کو برقرار رکھتا ہے۔ اس عمل سے گزر کر ہی عورت کو مکمل ہوتی ہے۔ لیکن میں اس عزاز سے محروم رہ گئی۔ چک اَپ کے بہانے بے ہوشی کی دوا دیکر مجھے ایک ایسی بنجر زمین بنا دیا گیا جس میں اب کبھی کونپل نہ پھوٹ سکتی تھی۔ کبھی کوئی پودا نہ اُگ سکتا تھا۔ اور یہ سب اس ظالم کی ایما پر ہوا تھا۔ اور جب نفرت کا زہر رگوں میں دوڑنے لگتا ہے تو انسان زہریلا بن جاتا ہے۔ میں بھی زہریلی ناگن بن گئی۔ یہ زہر میں ہر پل اس کے اندر اتارتی رہتی۔ جس کے ردعمل میں ہماری علیحدگی ہوگئی۔ تب سے میں تنہائی کے صحرا میں بھٹک رہی ہوں۔ میری روح پیاسی اور دل خالی ہے۔ بس وہ مجھے صرف ایک تحفہ دے دیتا تو پھر دیکھتا کہ میں اپنا تن من دھن سب کچھ اس پر وار نہ دیتی، لیکن اس نے تو میرے اعتماد کو ریزہ ریزہ کر دیا۔''

ان کے چہرے پر کرب کراہ اور محرومی نمایاں تھی اور آنکھوں میں بلا کا درد اور عجیب سی شکایت تھی۔ نہ جانے اس ظالم سے، خود سے یا پھر تقدیر سے۔ یہ غم دیمک کی طرح انہیں اندر ہی اندر چاٹے جا رہا تھا۔ اور ابھر بھری مٹی کی طرح بکھرتی جا رہی تھیں۔

ایک دن انہوں نے مجھ سے کہا۔

''تم میری زندگی کے اس المیہ کو قلمبند ضرور کرنا تا کہ آئندہ کوئی میری طرح فریب کھا کر برباد نہ ہو سکے۔''

پھر ایک دن اچانک ان کی حالت بگڑ گئی۔ مجھے خبر ہوئی تو میں بلا تاخیر ان کے پاس پہنچا۔ وہ آنکھیں بند کئے لیٹی تھیں۔ میرے آواز دینے پر انہوں نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ اور سرہانے سے ایک لفافہ نکال کر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''اسے رکھ لو۔'' ان کی آواز بہت ہی نحیف تھی۔ چند لمحے ان کی آنکھیں میرے چہرے پر مرکوز رہیں۔ پھر ان کی کیفیت عجیب سی ہونے لگی۔ میں نے گھبرا کر ان کا ہاتھ تھام لیا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرو۔ میں نے فوراً ڈاکٹر کو فون کیا لیکن اس کے آنے تک وہ ہمیشہ ہمیشہ کے خاموش ہو چکی تھیں۔ میرا دل درد سے پھٹ رہا تھا۔ کاش میں ان کی کوئی خدمت کر سکتا۔ لیکن وہ بڑی ہی خوددار تھیں۔ کسی سے خدمت لینا کسی کو تکلیف دینا انہیں گوارہ نہ ہوا۔ ان کے آخری رسومات کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ میں بھی بھاری دل اور غم آنکھوں کے ساتھ اس میں شریک تھا۔

جب میں انھیں سپرد خاک کر کے لوٹا تو مجھےس لفافہ کا خیال آیا۔ نہ جانے اس میں کونسی ہدایت، کون سی شرطیں ہوں گی۔ لیکن جب اسے کھول کر دیکھا تو دم بخود رہ گیا۔ انہوں نے اپنی کوٹھی میرے نام کر دی تھی۔ یہ کیسا بوجھ آپ نے میرے کندھوں پر رکھ دیا۔ لیکن آواز اس کے حلق میں پھنس کر رہ گئی۔

☆☆☆

ھاتھی کے دانت

ہر گلی، ہر نکڑ، ہر موڑ پر چند اشخاص محو گفتگو تھے۔ موضوع تھا مولانا گھیسو کی تشریف آوری کا۔ عقیدت مندوں میں سے ایک نے کہا:

''یہ ہماری بہت بڑی خوش قسمتی ہے کہ اتنے بڑے پہنچے ہوئے بزرگ صوفی ہمارے گاؤں میں قدم رنجہ فرمانے والے ہیں۔ میں تو پورے سال اسی انتظار میں رہتا ہوں کہ کب وہ تشریف لائیں، ہمارے سر پر ہاتھ رکھ دیں اور ہماری ساری کلفتیں دور ہو جائیں۔

ایک دوسرے شخص نے کہا:

''بھئی! اس کا سہرا تو ظہیر میاں کے سر جاتا ہے جو ہر سال انہیں مدعو کرتے ہیں اور صرف مدعو ہی نہیں کرتے بلکہ بڑی ہی عزت واحترام سے انہیں یہاں لاتے ہیں۔ دن رات ان کی خدمت میں جٹے رہتے ہیں۔ حاجت مندوں کا دروازے پر مجمع لگا رہتا ہے لیکن ذرا بھی پیشانی پر شکن نہیں آتی۔ بہت ہی خندہ پیشانی سے سبھوں کے ساتھ پیش

آتے ہیں۔ مولانا تو ہر وقت جذب کی سی کیفیت میں رہتے ہیں۔ جو ذرا سی کبھی آنکھیں کھولیں تو حاجتمند اپنا مدعا بیان کرتے ہیں۔ اگر انہیں اشارہ مل جاتا ہے تو سر پر ہاتھ رکھ دیتے ہیں گویا تمھارا بیڑا پار ورنہ آنکھیں ایسی بند کرتے جیسے کھولنا ہی بھول گئے ہوں۔ کوئی ہشاش بشاش بامراد لوٹتا ہے اور کوئی بے چارہ مایوس واپس جاتا ہے۔''

ایک تیسرے شخص نے کہا:

''میں بھی پچھلی بار گیا تھا۔ میرے بیٹے کی شادی کو دس سال کا عرصہ گذر گیا ہے مگر اب تک کوئی خوشی نہیں ملی۔ لیکن مولانا نے جیسے آنکھیں نہ کھولنے کی قسم ہی کھالی ہو''۔

ایک اور شخص نے کہا:

''ظہیر میاں تو ان کے ایسے مرید ہیں، ان سے ایسی عقیدت رکھتے ہیں کہ انھیں خود سے جدا کرنا ہی نہیں چاہتے۔ ہاں بھائی! انہیں اور کرنا ہی کیا ہے جو رونہ جاتا' اللہ میاں سے ناطہ۔ بیوی مر چکی ہے۔ دونوں بچیوں کی شادیاں ہو چکی ہیں۔ اب خدا سے لو لگائے بیٹھے ہیں۔ نیک کاموں کے لیے خود کو وقف کر دیا ہے۔ نا بھیا! میں تو کہوں کہ اوپر والا جسے چاہے توفیق دے۔ سنا ہے کہ انھوں نے گھر میں مدرسہ کھول رکھا ہے۔ گاؤں کے غریب بچوں کو ابتدائی تعلیم دیتے ہیں۔ ہاں یہ سچ ہے۔ گاؤں والے ان کے اس کار خیر سے بیحد خوش ہیں کہ ان کے بچے بغیر اجرت کے تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔''

سب اپنے اپنے خیالات کا اظہار کر رہے تھے اور یہ بات سو فی صد سچ بھی تھی۔ ہر طرف ظہیر میاں کی نیک نامی کے چرچے تھے۔ ہر دل ان کی مدح سرائی کر رہا تھا۔ کسی دل کو ان کی شرافت بھا گئی تھی تو کسی دل کو ان کی غریب پروری۔ کوئی ان کی فرشتہ صفت شخصیت کا مداح تھا تو کوئی ان کی خدا ترسی اور رحم دلی سے متاثر تھا۔ غریب پروری اور رحم دلی کا یہ عالم تھا کہ کوئی ضرورت مند ان کے در سے مایوس نہیں لوٹتا۔ غریبوں کی امداد کے لیے ہر وقت پیش پیش رہتے۔ فلاحی اداروں میں ہر سال ایک خطیر رقم ڈونیٹ کرتے۔

غرض بڑے ہی اللہ والے تھے۔ کسی اسلامی مجلس میں شریک ہوئے بغیر نہیں رہتے۔ وعظ ونصیحت بڑے غور خوض سے سنتے۔ صوفی سنتوں سے عقیدت رکھتے۔ پنج وقتی نماز مسجد میں ادا کرتے یہی سب تو اللہ والوں کی پہچان ہے۔ اب تو ان کے دروازے پر حاجت مندوں کا ہجوم رہتا ہے۔ گویا مولانا گھیسو کی کرسی انھوں نے سنبھال لی تھی۔ زبان میں تاثیر بھی بلا کی تھی۔ موت وزیست کے درواز پر کھڑے بچے ان کی دعاؤں کے اثر سے بہت جلد روبہ صحت ہو جاتے۔ گردش لیل ونہار کے ساتھ ساتھ ان کی مقبولیت اور عقیدت مندوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ ان کا پائجامہ گھٹنوں سے اوپر اور کرتا گھٹنوں سے نیچے ہوتا جاتا تھا۔ داڑھی اب سینے کو چھو رہی تھی۔ درس وتدریس کا سلسلہ جاری تھا۔ جو لڑکیاں ان کے یہاں سے پڑھ کر نکلتیں وہ بہت جلد پھوٹ کر جوان ہو جاتیں۔ نوراں نے بھی لڑکپن کی دہلیز کو پار کر لیا تھا۔

''اری نوراں کی ماں! تیری بیٹی کچھ بیمار ہے کیا؟'' ایک دن بشیرن نے نوراں کی ماں سے پوچھا۔

''نہیں تو۔'' نوراں کی ماں نے چونک کر بشیرن کو دیکھا۔

''ہاں! کل میں جب بڑی حویلی گئی تھی تو وہاں نوراں کو دیکھا۔ وہ مجھے بڑی کمزور سی لگی، بالکل مرجھائی ہوئی۔ بار بار اسے ابکائی بھی آرہی تھی۔ اسے ڈاکٹر سے ضرور دکھا دینا۔''

دوسرے دن جب نوراں کو اس کی ماں ڈاکٹر کے پاس لے گئی اور جو کچھ ڈاکٹر نے بتایا، اسے سن کر نوراں کی ماں کو ایسا لگا کہ جیسے وہ زمین میں دھنسی جارہی ہو۔ جب نوراں کے باپ کے کان تک یہ خبر پہنچی تو اس نے مار مار کر نوراں کا برا حال کر دیا۔ صبح سے شام تک اس کے حلق میں ایک دانہ بھی نہیں گیا تھا۔ تیرہ پورا کر کے چودھویں میں قدم رکھنے والی دھان پان سی نوراں جب بے حال ہو گئی تو کراہ اور ہچکیوں کے بیچ اس نے اپنی زبان

کھولی جسے سن کر باپ کی آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگیں۔ گویا انسانیت کے لبادے میں شیطنت پنپ رہی تھی۔

''تو ظہیر میاں! یہ ہے تمہارا اصلی روپ۔ بڑی بھاری اُجرت وصول کی ہے تم نے میں تو تمھیں ہرگز نہیں چھوڑوں گا۔''

نوراں کے باپ نے منھ سے جھاگ اڑاتے ہوئے کہا۔

پھر یہ خبر ہزار پوشیدہ رکھنے کے باوجود جنگل کی آگ کی طرح پورے گاؤں میں پھیل گئی۔ جس نے سنا اسی نے دانتوں انگلی کاٹی۔ ہر طرف چہ مگوئیاں، کانا پھوسی اور اشارے بازیاں شروع ہوگئیں۔ گاؤں کے چند غیرت مندوں نے اسلحہ سنبھالا اور ظہیر میاں کے گھر کی طرف چل پڑے لیکن یہ دیکھ کر سبھوں کو سکتہ لگ گیا کہ کمرے کے بیچوں بیچ ان کی لاش بڑی بے حرمتی سے پڑی تھی۔ ان کے ناپاک وجود سے یہ بستی پاک ہو چکی تھی۔

☆☆☆

پشیمان

آج پھر کچھ لوگ اسے دیکھنے کے لیے آنے والے تھے۔ آج اسے اپنی انا کو کچل کر، چہرے پر مصنوعی بشاشت اور ہونٹوں پر بناوٹی مسکراہٹ سے آنے والوں کا استقبال کرنا تھا۔ ان کے الٹے سیدھے سوالوں کا شائستگی سے جواب دینا تھا۔ اپنی کم مائیگی کو ان کی نظروں سے چھپانا تھا۔ برسوں سے یہ ڈراما کھیلا جارہا تھا اور وہ اس کی ایک اہم کردار تھی۔ لوگ آتے، قورمہ پلاؤ اُڑا کر ڈکار لیتے ہوئے چلے جاتے۔ کبھی لڑکی کا سانولا رنگ قابل اعتراض ہوتا، کبھی اس کا لاغر پن تشویش کا باعث ہوتا۔ اور کبھی جب سب کچھ تشفی بخش ہوتا تو پھر یہ سوال کھڑا ہو جاتا کہ لڑکی کس خاندان کی ہے؟ اس کے ماں باپ بھائی بہن رشتے ناطے والے کون ہیں، کہاں ہیں؟ سینکڑوں سوالات اُٹھتے۔ اس کھیل سے اب وہ تنگ آچکی تھی۔ جی میں آتا کہہ دے:

''میں کوئی لنگڑی لولی نہیں ہوں۔ نہیں ہے مجھے کسی سہارے کی ضرورت۔ خدا نے مجھے دو ہاتھ، دو پاؤں، دو آنکھیں، دل دماغ اور عقل سمجھ عطا کی ہے۔ پھر میں کیوں

تماشابنوں؟ کیوں رحم طلب نگاہوں سے کسی کی طرف دیکھوں؟ کیوں فقیروں کی طرح جھولی پھیلاؤں؟ عورتوں کی اِنھی کمزوریوں نے مردوں کے حوصلے بلند کردیے ہیں۔ چاہے وہ خود کسی قابل ہوں یا نہ ہوں' خواہ ساری زندگی بیوی کی کمائی پر عیش کرتے رہے ہوں لیکن احساس برتری کے نشہ میں چور رہتے ہیں۔ ابانے چاہے مجھے کچھ دیا ہو یا نہیں' اپنا نام' اپنی فرزندی میں قبول نہ کیا ہو لیکن ان کا احسان ہے کہ انہوں نے مجھے اس قابل بنادیا ہے کہ میں خود اپنا سہارا بن سکتی ہوں لیکن یہ سماج اور سماج کے ٹھیکے دار چین سے جینے نہیں دیتے اور اوپر والا احرام موت مرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ پھر میں کیا کروں؟''

اس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ ساری ساری رات اس سوچ میں گزر جاتی کہ لوگ کیوں لاوارث بچوں کو اٹھالاتے ہیں؟ اگر اٹھاتے ہی ہیں تو اپنا نام دینے کا حوصلہ کیوں نہیں رکھتے۔ وہ ریں ریں کرتی بچی ہر وقت اس کے ذہن پر مسلط رہتی جو اپنے خارش زدہ پاؤں کو زمین پر رگڑتی رہتی۔ آنکھوں اور ناک سے بے تحاشہ پانی گرتا رہتا۔ سر کے بالوں کو دونوں ہاتھوں سے نوچتی کھسوٹتی رہتی جو خارش کے علاوہ جوؤں سے بھرا رہتا۔ ابا جب کام پر سے لوٹتے تو اسے پیار کرتے' منھ ہاتھ صاف کرتے' کپڑے بدلتے۔ پھر انگلی تھام کر بازار لے جاتے۔ ٹافی اور کھلونے دلواتے۔ وہ اسے خود سے نہلاتے۔ اس کے کپڑے دھوتے۔ اس طرح وہ ریں ریں کرتی ہوئی بچی پرائمری اسکول تک پہنچ گئی۔ وہاں جب بچوں کی مائیں کبھی بچوں کو لے جانے یا ان کا رپورٹ کارڈ لینے کے لیے آتیں تو اسے بہت اچھا لگتا۔ وہ پوچھتی:

''ابا! میری ماں کہاں ہے؟'' ابا اسے پیار کر کے کہتے:

''جب تم بڑی ہو جاؤ گی تو خود ہی تمھیں سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔''

پھر نہ جانے کیوں ابا نے نوکری چھوڑ دی اور اسے ساتھ لے کر گاؤں آگئے۔ وہاں اسے دیکھنے والوں کی بھیڑ لگ گئی جیسے وہ کوئی عجوبہ ہو۔ اس کی سمجھ میں نہیں

آ رہا تھا کہ یہ لوگ اتنے حیرت زدہ کیوں ہیں؟ وہاں امی تھیں۔ بہن بھائی تھے۔ پھوپھی‘ خالہ تھیں لیکن کسی نے اسے لپٹا کر پیار نہیں کیا۔ بڑا سا کنبہ تھا۔ سب کے گھر آس پاس تھے۔ ہر گھر میں یہ بات گفتگو کا موضوع بنی ہوئی تھی:

’’بھابھی! سنا تم نے؟ نعیم بھائی ایک لڑکی لے کر آئے ہیں۔‘‘

’’ارے ہوگی اُنھی کی بیٹی۔ وہاں کسی سے شادی وادی کر لی ہوگی۔ آخر اتنے دنوں وہاں کیسے گزارا؟ وہ کہتے ہیں انہوں نے اسے ایک مسجد سے اٹھا کر پالا ہے۔ چلو اچھا ہے کبھی کام ہی آ جائے گی۔‘‘ اور سچ مچ وہ ایسی کام آئی کہ سب کی آنکھوں کی پتلی بن گئی کبھی اس رشتہ دار تو کبھی اس رشتہ دار کے دل کو موہتی رہتی۔ سب اسے پیار کرنے لگے تھے۔ وہ تھی ہی اتنی پیاری اتنی معصوم‘ خاموش طبع‘ مہذب اور خدمت گزار۔ سب کی خواہش ہوتی کہ وہ اُنھی کے پاس رہے لیکن کوئی اسے اپنا رشتہ دار کہنے کے لیے تیار نہ تھا۔ یہ بات جب اس کے دل میں کانٹوں کی طرح چبھنے لگی تو اس نے پوچھا۔

’’ابا! سچ مچ بتایئے میں کون ہو؟ آپ سے میرا کیا رشتہ‘ کیا تعلق ہے؟‘‘ ابا اس غیر متوقع سوال پر گھبرا گئے۔ تھوڑی دیر خاموشی کے بعد کہا۔

’’تم میری بیٹی ہی جیسی ہو۔‘‘

’’بیٹی جیسی ہوں‘ کیا میں آپ کی بیٹی نہیں ہوں؟‘‘

’’نہیں جب تم دو سال کی تھیں تو میں نے تمھیں ایک مسجد سے اٹھا کر پالا ہے۔ وہ محرم کی دس تاریخ تھی اس لیے میں نے تمھارا نام امام باندی رکھا۔‘‘

اس کی اُٹھی ہوئی پلکیں جھک گئیں۔ دل سے یہ آواز آئی ابا! کاش آپ کہہ دیتے کہ میں آپ ہی کی بیٹی ہوں۔ شک تو اسے پہلے ہی سے تھا لیکن اب تو ابا نے سب کچھ واضح طور پر بتا دیا تھا لہٰذا اب شک وشبہ کی کوئی گنجائش باقی نہ رہی تھی۔ اس انکشاف نے اسے اس قدر ساکت کیا کہ وہ بالکل خاموش ہو کر رہ گئی تھی۔ لیکن ابا سے اسے ایک خاص

لگاؤ تھا۔ اپنے یا پرائے آخر سب کچھ وہی تو تھے۔ کہتے ہیں کہ نام کا اثر بہت ہوتا ہے۔ واقعی وہ اپنے نام کی مناسبت سے باندی ہی بن کر رہ گئی تھی۔ ابا کوئی ذی حیثیت شخص نہ تھے۔ باپ دادا نے کچھ چھوڑا نہیں تھا۔ بیٹے نے کوئی کارنامہ انجام نہیں دیا۔ بیٹی بیاہ کر اپنے گھر بار کی ہو گئی۔ امی جو دائمی مریض تھیں، ایک لمبی علالت کے بعد رحلت فرما گئیں۔ ابا بہت ہی کمزور ہو گئے تھے۔ معاشی حالات بدلے بدتر ہوتے جا رہے تھے۔ ان نامساعد حالات میں ابا کی عنایتوں کا قرض اس نے یوں اتارا کہ اُنھیں ساتھ لے کر شہر آ گئی۔ وہاں ایک بوتک میں کام پر لگ گئی۔ چند چھوٹے بچوں کو ابتدائی درس بھی دینے لگی۔ اس طرح ابا کا سہارا بن گئی۔ ابا اب بہت چپ چپ اور پریشان سے رہنے لگے تھے۔ شاید اس لیے کہ اب اس کا رشتہ آنا تقریباً بند ہو چکا تھا اور اس نے تو اپنے ذہن سے یہ بات بالکل نکال دی تھی کہ کاتب تقدیر اس کی قیمت میں ازدواجی سکھ لکھا بھی ہے یا نہیں۔

وقت اپنی ڈگر پر چل رہا تھا۔ صبح ہوتی تھی شام ہوتی تھی، عمریوں ہی تمام ہوتی تھی۔ وہ لاغر سی سانولی لڑکی اب بہت بدل چکی تھی۔ چہرہ گول اور رنگ سنہرا ہو گیا تھا۔ گردش وقت نے اسے اور بھی سنجیدہ بنا دیا تھا۔ وہ ہر وقت دوپٹہ سے اپنا سر ڈھکے رہی تھی۔ ایک دن اتفاق سے آنچل سر سے سرک گیا تو اچانک ابا کی نظر اس کے بالوں میں جھملاتے ہوئے بے شمار چاندی کے تاروں پر پڑ گئی۔ وہ دھک سے رہ گئے۔ اندر پکڑ دھکڑ ہونے لگی۔ احساس جرم سے نظریں نہیں اٹھ رہی تھیں۔ کیا منھ دکھاؤں گا خدا کو؟ کیا جواب دوں گا، جب وہ پوچھے گا تیرے سچ بولنے میں کون سی بات مانع تھی؟ کیا بندوں کا خوف خدا کے خوف پر غالب تھا؟

☆☆☆

بیڑیاں

زندگی نام ہے جدوجہد کا چلتے چلتے چلو اس وقت تک جب تک منزل پاس نہ آجائے۔ اس قول کو مدنظر رکھتے ہوئے وہ اپنی جدوجہد کا سفر جاری رکھے ہوئے تھا۔ وہ بڑی باقاعدگی سے ہر روز ویکینسی کا کالم دیکھتا پھر جھٹ عرضی دے دیتا جو زیادہ تر ردی کی ٹوکری میں پہنچ جاتی۔ کبھی بلاوا آتا تو بہت ہی امید کے ساتھ وہاں پہنچ جاتا جہاں امیدداروں کی ایک لمبی قطار ہوتی۔ وہ بھی ان میں شامل ہو جاتا۔ بہت انتظار کے بعد جب اس کی باری آتی تو بڑے اعتماد کے ساتھ انٹرویو ہال میں داخل ہو جاتا۔ وہ انٹرویو دیتے دیتے اتنا منجھ چکا تھا کہ اب اسے کوئی جھجک محسوس نہ ہوتی۔ بہت ہی ناپ تول کر ہر سوال کا صحیح صحیح جواب دیتا لیکن پھر بھی ناکام رہتا کیونکہ یہاں نہ کوالیفیکیشن کام آتا ہے نہ قابلیت۔ انٹرویو بورڈ کے چیرمین کے ہاتھوں میں پورا اختیار ہوتا ہے اور اس کے سامنے سب سے پہلے اپنا مفاد رہتا ہے۔ پھر بھی اس کی جدوجہد کا سفر جاری تھا لیکن کہیں منزل نظر نہیں آرہی تھی۔ اگر کچھ نظر آرہا تھا تو دو ننھے منے بچے اور بیوی کا مایوس چہرہ۔ نہ جانے ماؤں کو

بیٹے کے سر پر سہرا سجانے کی کیوں اتنی جلدی رہتی ہے۔ اسے یاد آیا کہ ہزار انکار کرنے پر بھی بزرگوں نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا۔

”ارے میاں! شادی کر کے تو دیکھو۔ مرد کی قسمت سے اولاد اور عورت کی قسمت سے رزق ملتا ہے۔ بے شک رزق دینے والا خدا ہے۔ اب چاہے عورت کی قسمت سے ملے یا مرد کی۔ لیکن وہ یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ ہوا کا رخ بدل گیا ہے ساری theories بدل گئی ہیں۔ طور طریقے تہذیب تمدن اور سوچنے کا انداز بدل گیا ہے۔ قناعت نام کی چیز باقی نہیں رہی۔ بیوی آتے ہی طرح طرح کے مطالبے کر کے زندگی کو تلخ بنا دیتی ہے۔ جو صبر و تحمل سے کام لیتی ہے وہ ایسی مسکین صورت بنا لیتی ہے کہ شوہر خود کو اس کا مجرم سمجھنے لگتا ہے۔ یہی خلش اس کے استقلال کو متزلزل کر رہی تھی:

اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے

شاعر کا یہ خیال کچھ الٹا ہی تاثر دے رہا تھا۔ یہاں آسانیوں نے نہیں دشواریوں نے زندگی کو دشوار بنا دیا تھا۔ تھک ہار کر اس نے اپنی جدوجہد کا رخ پھیر لیا۔ اس نے سوچا' اب ہندوستان سے باہر جا کر قسمت آزمائی کرے۔ یہاں بھی انٹرویو کا سلسلہ جاری تھا۔ کبھی دلی اور کبھی ممبئی جا کر انٹرویو دیتا رہتا۔ خدا خدا کر کے باہر کی ایک کمپنی میں بطور سیلس مین اس کا سلیکشن ہو گیا۔ اپنی اس کامیابی پر وہ خوش بھی تھا اور اداس بھی۔ معاشرے کی کوتاہ نظری' ناانصافی' بے ایمانی اور خود غرضی نے اسے وطن سے بے وطن کر دیا تھا۔ خیر نیا وطن' نئی جگہ' نئے لوگ' مختلف زبان۔ کوئی اپنا نہ کوئی پرایا۔ کچھ دنوں تک وہ عجیب سی کیفیت میں مبتلا رہا۔ پھر جس مقصد کے لیے آیا تھا اس میں جٹ گیا۔ بارہ بارہ گھنٹے کھڑے ہو کر ڈیوٹی دینی پڑتی۔ تھکے ہوئے جسم کے ساتھ جب وہ اپنی قیام گاہ پر آتا تو کوئی اس کا منتظر نہ ہوتا۔ وہ سوچتا' نہ جانے کیوں لوگ یہ دعا دیتے ہیں جہاں رہو خوش رہو۔ چلتے وقت بزرگوں نے بھی اس سے یہی دعا دی تھی۔ بھلا کوئی اپنوں سے

جدا ہو کر بھی خوش رہ سکتا ہے؟اس کے ہونٹوں پر ایک تلخ سی مسکراہٹ پھیل گئی۔کتنی بار اس نے سوچا کہ یہاں کے حالات زندگی اور اپنی کیفیت کے بارے میں گھر والوں کو بتائے لیکن ان کا خوشی سے دمکتا ہوا چہرہ نظروں کے سامنے آجاتا تو سوچتا کیوں اپنا دکھڑا رو کر ان کی آس کو مایوسیوں میں بدلوں۔اب تک نہ جانے انھوں نے کتنے خواب دیکھ لیے ہوں گے۔دلوں میں کتنی خوش فہمیاں پال لی ہوں گی جیسے وہ جنت ہی پہنچ گیا ہو۔جنت نما ملک' جہاں دلکش مناظر ہوں گے' بڑے بڑے مال اور ہوٹلس ہوں گے اور جہاں وہ لذیذ کھانوں سے لطف اندوز ہو رہا ہوگا۔

کچھ دنوں بعد کئی ہندوستانیوں سے اس کی ملاقات ہوگئی۔پھر واقفیت کا دائرہ وسیع ہوتا گیا۔چھٹی کے دن وہ ان دوستوں کے ساتھ تھوڑا وقت گزار لیتا۔کبھی کبھی کسی غلطی پر باس اسے بری طرح جھڑک دیتا جیسے وہ اس کا پرسنل ملازم ہو۔باس کے تلخ و ترش اور تحقیر آمیز جملے اس کی انا کو جھنجھوڑ دیتے۔مایوس ہو کر وہ لوٹ جانے کے لیے بے چین ہو جاتا۔اکثر دوستوں سے کہتا' میں بہت جلد گھر لوٹ جاؤں گا۔لیکن ہر ماہ جب بہت سارے نوٹ ہاتھوں میں آجاتے تو وہ سوچتا کسی طرح ایک سال اور کٹ جائے تو وہ ایک خطیر رقم لیکر گھر لوٹے۔اب اس کے لیے دن گزارنا مشکل ہوتا جا رہا تھا لیکن کسی طرح اس نے دو سال پورے کر لیے تھے اور اب واپس جا رہا تھا۔جب جہاز نے اڑان بھری تو اس نے سکون کی سانس لی۔دوران سفر وہ یہ سوچتا رہا کہ اب اپنی باقی زندگی کے دن اپنے ملک میں رہ کر ہی گزارے گا جہاں آزادی ہے' سکون ہے' محبت اور عزت ہے۔ان دو سالوں میں اس نے جتنا پایا تھا اس سے زیادہ کھویا تھا۔اپنی زندگی کے بیش قیمت دو سال گنوائے تھے۔جب وہ بہت ساری سوغات اور ایک بڑی رقم لے کر گھر پہنچا تو سب کے چہرے خوشی سے دمک اٹھے۔سب اپنے اپنے تحائف لے کر خوش تھے اور بچے کھلونے دیکھ کر پھولے نہ سما رہے تھے لیکن چند دنوں بعد جب اس نے بتایا کہ اب وہ واپس نہیں

جائے گا تو سب کے چہرے مرجھا گئے ۔ایک ماہ بھی نہیں گزرا تھا کہ گھر کے ہر فرد کے چہرے پر تشویش کے آثار رونما ہونے لگے۔لوگوں نے اس کو سمجھانا شروع کر دیا کہ کم سے کم دو چار سال کے لیے اور چلے جاؤ کیوں کہ ابھی تمہارے بچوں کو تم سے زیادہ تمھارے پیسوں کی ضرورت ہے تا کہ وہ اچھی تعلیم پا سکیں لیکن وہ کسی حال میں جانے کے لیے تیار نہ تھا۔ اس ماحول میں اس کا دم گھٹتا تھا۔وہاں سب کچھ تھا لیکن اپنوں کا ساتھ نہ تھا اور حال یہ تھا کہ:

پڑیئے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار

اور گر مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

پھر اسے ایسا لگنے لگا کہ ہر کوئی اسے شکایتی نظروں سے دیکھ رہا ہے‘ لوگوں کی آنکھوں میں خوشی کی لو ماند پڑتی جا رہی ہے کیونکہ اس سے زیادہ گھر والوں کو اس کے پیسوں کی ضرورت ہے۔ بیٹے نے کہا:

’’پاپا اگلی بار اس سے بڑا ایروپلین لایئے گا۔‘‘

بیٹی نے کہا:

’’پاپا! میرے لیے باربی ڈول ضرور لایئے گا۔‘‘

بچوں کی آنکھوں میں ناچتی ہوئی کھلونوں کی چاہ نے اس کے اعصاب ڈھیلے کر دیے اور اس کے ارادے میں لغزش پیدا ہوگئی۔تب اس نے سامان سفر باندھا۔سبھوں کے مرجھائے ہوئے چہرے کھل اٹھے۔رخصت ہوتے وقت اس نے مرجھائے ہوئے دل سے سب کی طرف دیکھا تو اندر سے آواز آئی ’’الوداع‘‘ اور اس نے ادھر اُدھر دیکھے بغیر تیزی سے اپنے قدم آگے کی طرف بڑھا دیے۔

☆☆☆

مقنا طیس

جب میرے بیٹے نے مجھے بتایا کہ وہ دوبئی جا رہا ہے تو کچھ دیر کے لیے مجھ پر سکتہ طاری ہوگیا۔ میں عجب سی کیفیت میں گھر گئی لیکن اسکے چہرے پر پھوٹتی ہوئی خوشی اور اطمینان کی جھلک دیکھ کر میرا دل بھی خوشی سے بھر آیا۔ آخر حالات سے سمجھوتہ تو کرنا ہی تھا۔ اور ویسے بھی پیسے میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ جس طرح مقناطیس لوہے کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے اسی طرح لوہے جیسے مضبوط اور پختہ ارادے والے بھی اس کی طرف کھینچے چلے جاتے ہیں۔ تبھی تو مجھ جیسی وطن پرست' ہمیشہ یہ کہنے والی کہ باہر کی پوری روٹی سے وطن کی آدھی روٹی بہتر ہے' یہ سمجھنے پر مجبور ہوگئی کہ جب خود پر پڑتی ہے تو سارے فارمولے' سارے اصول دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ دل کے بہلانے کو یہ خیال کافی ہوتا ہے کہ جہاں جس ڈھیر میں جس کا رزق ہوتا ہے وہ وہیں پہنچ جاتا ہے۔

تو میرے بیٹے کا رزق بھی جہاں تھا وہ وہیں پہنچ گیا۔

جب رزق کی ریل پیل ہوئی تو کایا ہی پلٹ گئی۔ ہر طرف رونق اور ہریالی

چھا گئی۔ مردہ چیزوں میں جان پڑ گئی۔ دوست احباب، دور پار کے رشتہ دار حال احوال پوچھنے لگے۔ کوئی کسی کو کچھ دے یا نہ دے پیسے کی چمک ہر کسی کو اپنی طرف کھینچ ہی لیتی ہے۔ سب جاننے اور پہچاننے لگتے ہیں۔ یہی دنیا کا دستور ہے۔

ایک زمانہ تھا جب باپ کے نام سے بیٹا جانا جاتا تھا لیکن اب اکثر بیٹے کے حوالے سے لوگ والدین کو پہچانتے ہیں۔ ہمارے بیٹے نے بھی ہماری پہچان قائم کرنے میں اہم رول ادا کیا۔

جب گھر میں خوشحالی آئی تو ہری ہری سوجھنے لگی۔ سیر و سیاحت کا شوق چرایا تو ہم دوبئی پہنچ گئے۔

اس ملک میں ہر شخص آسودہ اور خوشحال ہے۔ نہ کسی بات کا ڈر نہ خوف۔ چیزوں کی ریل پیل ہے۔ پیسوں کی فراوانی ہے۔ لوگ ٹرالی بھر بھر کر سامان خریدتے رہتے ہیں۔ صبح سے رات تک یہی نظارہ دیکھنے میں آتا ہے۔

یہاں کی سج دھج، تزک بھڑک، پرکشش نظام اور معاشی آسودگی لوگوں کو اپنے شکنجے میں جکڑ لیتی ہے۔ میں اکثر سوچتی ہوں کاش! ہمارا ملک بھی ان خوبیوں کا حامل ہوتا۔ کاش! ہم کسی کے دست نگر نہ ہوتے۔ ایمانداری کے ساتھ اپنی صنعت کو فروغ دیتے۔ جھوٹ، مکروفریب اور بے ایمانی کا سہارا نہ لیتے تو آج پردیسوں میں بے وطن ہوکر زندگی نہ گزارتے۔

ان دونوں دوبئی فسٹیول لگا ہوا تھا۔ روز پیپر اور ٹی وی پر خبریں آرہی تھیں۔ ایک دن ہم لوگ بھی میلہ دیکھنے وہاں پہنچ گئے۔

یہ میلہ کیا تھا بس سمجھ لو ایک شہر آباد تھا۔ نہ جانے کتنے رقبے میں پھیلا ہوا یہ میلہ برقی قمقموں سے جگمگا رہا تھا۔ سجاوٹ ایسی جو آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھی۔ برصغیر کے کئی ملکوں کے الگ الگ اسٹال لگے ہوئے تھے جہاں بھانت بھانت کی چیزیں لوگوں کی

توجہ کا مرکز بنی ہوئی تھیں۔ بھانت بھانت کی بولیاں بولنے والے بڑے بوڑھوں، رنگ برنگی پوشاک پہنے بچوں اور فیشن ایبل لڑکے لڑکیوں کا ایک ہجوم تھا۔ بے شمار دروازے تھے۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ہم کدھر سے آئے ہیں اور کدھر جانا ہے۔ ہر ایک کے ہاتھ میں موبائل تھا کہ اگر خونخواستہ راستہ بھول جائیں یا اپنے ساتھی سے بچھڑ جائیں تو رابطہ کرسکتے ہیں۔ وہاں کلچر پروگرام بھی منعقد کیا گیا تھا جس میں ہندوستانی پاکستانی، عربی، عمانی، سوڈانی، رشین، افریقین، اور نہ جانے کہاں کہاں کے پروگرام دکھائے جارہے تھے۔ اس پروگرام کو دیکھ کر یہ محسوس ہوا کہ یہاں کے ماحول پر مغربی تہذیب کچھ زیادہ ہی اثر انداز ہے۔ فنکار اپنے فن کو زیادہ سے زیادہ مقبول بنانے کے لیے آرٹ کے نام پر بے حیائی کا مظاہرہ کررہے تھے اور کچھ لوگ خریداری میں جٹے ہوئے تھے۔ جھولے بھر بھر کر سامان خرید رہے تھے۔ جیسے انہیں قارون کا خزانہ مل گیا ہو۔

زیادہ سے زیادہ آسائشوں کی ہوس اور مقابلے کی دوڑ نے انھیں مشین بنا کر رکھ دیا تھا۔ صبح سے رات تک وہ مشین کی کی طرح چلتے رہتے۔ کسی کو کسی کی خبر نہ ہوتی۔ کسی کے پاس دوسروں کے لیے وقت نہ ہوتا۔ ایک ہی بلڈنگ میں رہ کر جان پہچان ہوتے ہوئے بھی لوگ ایک دوسرے سے مہینوں نہیں مل پاتے۔ ایسے میں جب کبھی دروازے پر کال بل بجتا تو ایسا لگتا جیسے کوئی کانوں میں رس گھول رہا ہو۔ یہ آواز دنیا کی سب سے خوش الحان موسیقی لگتی۔ جب میں یہاں سے اپنے وطن کا موازنہ کرتی تو اس بات پر فخر ہوتا کہ اب بھی ہم اپنی روایت قائم رکھے ہوئے ہیں۔ اپنے پرائے، دوست پڑوسی کی خوشی اور غم میں شریک ہونا، ان کا دکھ درد بانٹنا فرض سمجھتے ہیں۔ ہماری مصروفیت اس اہم کام میں آڑے نہیں آتی۔

اکثر ایسا ہوتا کہ میں کبھی فون اور کبھی دروازے کی گھنٹی سے بیزار ہوجاتی لیکن اگر کبھی گھنٹی بجنی کم ہوجاتی تو فکر بھی ہونے لگتی۔ دل کھٹ پٹ کرنے لگتا۔ اپنا تو جینے کا

انداز ہی یہی ہے۔

ناچاقیاں نااتفاقیاں بھی ہوتی ہیں، لڑائی جھگڑے بھی ہوتے ہیں لیکن جب گلے مل جاتے ہیں تو کتنا مزہ آتا ہے۔ سارے گلے شکوے دور ہوجاتے ہیں۔ کدورتیں مٹ جاتی ہیں۔ وہ جذبے جاگ جاتے ہیں جو رشتوں کے تقدس کو برقرار رکھتے ہیں۔ ہاں ایک دکھ ضرور ہے کہ نہ جانے ہمارے وطن کو کس کی بددعا لگ گئی ہے یا کس کا منحوس سایہ اس پر پڑ گیا ہے کہ کوئی بھی آسودہ اور مطمئن نہیں ہے۔ ہر شخص پریشان حال ہے۔ چاہے وہ غریب ہو یا امیر۔ غریب پیسہ حاصل کرنے کے لیے پریشان ہے تو امیر پیسہ کی حفاظت کے لیے۔

دن دھاڑے چوری، ڈکیتی، لوٹ مار، جھگڑا فساد، خون ریزی اور اغوا کی وار داتوں نے لوگوں کو ہراساں کر رکھا ہے۔ ہر شخص خوف زدہ ہے۔ راہ چلتے ایک دوسرے کو شک کی نگاہ سے دیکھتا ہے کہ کہیں وہ اچانک کسی حملے کی زد میں نہ آجائے۔

روز بروز یہ جراثیم پھیلتے ہی جارہے ہیں لیکن اب تک کوئی ایسی دوا ایجاد نہ ہوسکی ہے جو سارے ضرررساں جراثیم کا خاتمہ کردے۔ شاید اب دعاؤں کی ہی ضرورت ہے۔

تو آیئے! ہم سب مل کر دعا کریں کہ ہمارا ملک بھی ایک آئیڈیل ملک بن جائے کہ آخر ہمیں تو یہیں رہنا ہے۔ ہم دوسروں کے سہارے کب تک جیتے رہیں گے؟

☆☆☆

صبح کا بھولا

کہتے ہیں کہ وجودزن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ۔

لیکن اکثر حالات اس کے بالکل برعکس ہوتے ہیں۔ وجودزن سے نہ صرف زندگی بے رنگ اور بے کیف ہو جاتی ہے بلکہ کبھی کبھی عذاب بھی بن جاتی ہے۔ میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ میں اس ساعت کو کوس رہا تھا جب یہ ڈھول میرے گلے پڑا تھا۔ لیکن بقول شخصے:

"جب گلے میں پڑا ڈھول تو بجانا ہی پڑا۔"

کبھی کبھی دل چاہتا اسے گلے سے اتار کر پھینک دوں لیکن سانپ کے منہ میں چھچھوندر والی حالت تھی۔ نہ نگلتے چین نہ اُگلتے چین۔ اگر نگلو تو اندھا اور اگلو تو کوڑھی والا معاملہ تھا۔ ناچار مرتا کیا نہ کرتا۔ اس بد دماغ اور شکی مزاج کے ستم کا نشانہ بنا اس کی جوتیاں سیدھی کر رہا تھا۔ سوکھی لکڑی کی طرح اکڑی ہوئی اس کی شخصیت بہت ہی سخت تھی۔ بے حد خشک مزاج اور بد ذوق۔ نہ خود کسی تفریح میں حصہ لیتی اور نہ مجھے اس کی

اجازت دیتی۔ زندگی بس گھر سے آفس اور آفس سے گھر تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ یہی نہیں، وہ پل پل کا حساب بھی لیتی۔ اگر کبھی آفس سے لوٹنے میں آدھا گھنٹہ بھی دیر ہوجاتی تو حساب لینے کھڑی ہوجاتی۔

''آج پھر اتنی دیر کیوں ہوگئی۔ کیا آفس سے دیر سے نکلے یا راستہ جام تھا۔ ارے ادھر اُدھر بھٹکنے سے بہتر ہے کہ وقت پر گھر آکر آرام کرو۔''

''تم اپنا بھاشن بند کرو۔ انسان ہوں کوئی مشین نہیں۔ راستے میں کوئی ملاقاتی مل جاتا ہے تو بات چیت میں تھوڑا وقت گزر ہی جاتا ہے۔'' مجھے بھی غصہ آگیا۔

''وہی تو میں سمجھانے کی کوشش کر رہی ہوں۔ دوست احباب کے چکر میں زیادہ نہ پڑو۔ ان میں بعضے تو لوٹ لیتے ہیں اور بعضے غلط راستے پر ڈال دیتے ہیں۔''

اس کی باتوں سے میرا پارہ ایک سو ایک ڈگری چڑھ گیا۔ میں اسے کھری کھوٹی سنانا چاہتا تھا لیکن گھر کو جنگ کا اکھاڑا بنانے کے ڈر سے خاموش ہوگیا۔ میں اس کی ڈکٹیٹر شپ سے عاجز آکر فرار تلاش کرنے لگا۔ آخر چاہ کو راہ مل ہی گئی۔ اب آفس ٹائم کے بعد دو تین گھنٹہ دوستوں کے ساتھ گزارتا۔ زیادہ تر میں اپنے بہت ہی قریبی دوست عارف کے یہاں جاتا۔ وہاں کھلی فضا اور خوشگوار ماحول میں وقت کا پتہ ہی نہیں چلتا۔ اس کی بیوی بڑی ہنس مکھ تھی۔ سر تا پا شیشے کی طرح چمکیلی اور کچی شاخ کی طرح لچکیلی۔ جب بات کرتی تو لچک لچک جاتی۔ ایسا دلکش سراپا جس میں ڈوب کر دنیا اور مافیہا کو بھول جانے کو جی چاہے۔ مجھے عارف کے نصیب پر رشک آتا۔ لیکن چارا ہی کیا تھا۔

یہ تو اپنے اپنے نصیب کی بات ہے۔

وہ جسے چاہے جو بھی عطا کرے۔

ایک دن جب میں اس کے گھر پہنچا تو دروازہ اسی دلربا نے کھولا۔ میں نے چاروں طرف نظریں گھماتے ہوئے پوچھا۔

''عارف کہاں ہے۔''

''آپ آیئے نا! تکلف کیوں کر رہے ہیں۔وہ بھی آ ہی جائیں گے۔ جب تک ایک ایک پیالی چائے کی ہو جائے۔''

وہ چائے بنا کر لے آئی' اور چائے کے درمیان جہان بھر کی باتیں کرتی رہی۔ میں سحر زدہ سا خاموش دیکھتا رہا۔

میرے پاؤں میں ایسی کون سی بیڑیاں پڑ جاتیں جو مجھے وہاں سے ہلنے نہ دیتیں۔کوئی ان دیکھی قوت مجھے وہاں روک لیتی۔ وہ لچھے دار باتیں کرتی رہتی اور میں اپنے اردگرد سے بے خبر اس کی باتوں کے طلسم میں کھو جاتا۔ وہ روز بروز مجھ سے قریب تر ہوتی جا رہی تھی۔

لیکن کبھی کبھی میرا ضمیر مجھے ملامت کرتا۔ دوست کے ساتھ یہ غداری کیا یہ صحیح ہے۔لیکن جب انسان کو کسی چیز کی لت پڑ جاتی ہے خواہ وہ شراب ہو یا شباب تو پھر برے بھلے صحیح غلط' جائز ناجائز' گناہ ثواب کا فرق مٹ جاتا ہے۔

اب میں تقریباً روز ہی دیر سے گھر لوٹتا۔ یہ معمول بن چکا تھا۔ جب بیوی نے دیر سے آنے کا سبب پوچھا تو میں یہ کہہ کر صاف نکل گیا کہ اوور ٹائم میں رہتا ہوں۔

لیکن وہ بھی ایک کائیاں قسم کی عورت تھی۔ پائی پائی کا حساب لیتی۔

''اتنی اتنی دیر تک اس قدر محنت کرتے ہو تو پیسہ کہاں جاتا ہے؟ دوستوں کی تحویل میں' یا مجھے بے وقوف بنا رہے ہو؟ میں تم مردوں کی چالاکی کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ آفس میں گل چھرے اڑاتے ہو۔اپنی کلیگ کے ساتھ رنگ رلیاں مناتے ہو۔ میں سارا دن تنہا رہتی ہوں۔ شام سے انتظار کرتے کرتے تھک جاتی ہوں۔ میرے صبر کو زیادہ نہ آزماؤ۔نہیں چاہئے مجھے اوور ٹائم۔ کیا میں تم سے کمخواب اطلس مانگتی ہوں؟''

اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔اور میں چور سا بن گیا۔

''اچھا بابا اچھا! جوتم کہوگی وہی ہوگا۔کل سے میرے اوور ٹائم بند۔''

تین دنوں تک میں اس فرضی اوور ٹائم پر نہیں گیا۔لیکن منھ سے لگی کب چھوٹتی ہے۔چوتھے دن پھر وہاں پہنچ گیا۔اس روز دروازہ کھولنے والا ایک مرد تھا۔میں نے کھوجتی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''آپ کی تعریف؟''

''میں بھی آپ ہی کی طرح عارف کا دوست ہوں۔''

''اوہ !آئی سی۔'' گویا اس میدان میں صرف ایک میں ہی کھلاڑی نہیں ہوں۔مجھے اس موہنی صورت والی سے خوف آنے لگا جو قربانی کے بکروں کو کند چھری سے حلال کر کے ان کے تڑپنے کا تماشا دیکھتی تھی۔عارف کا بھولا بھالا معصوم چہرہ نظروں کے سامنے آ گیا۔اس بے چارے کو کیا خبر کہ دو مخالف صنفوں کے درمیان جو شیطان حائل رہتا ہے۔وہ اکیلے کیسے گل کھلا رہا ہے۔مجھے اپنی بیوی یاد آنے لگی۔بے چاری نہ جانے کب سے میرا انتظار کر رہی ہوگی۔اور میرے پہنچتے ہی کتنی ڈانٹ پلائے گی۔لیکن آج میں ڈانٹ کے بدلے ڈانٹ اور جھگڑا نہیں کروں گا۔بڑے ہی پیار سے اسے اپنی بانہوں میں بھرلوں گا۔یہ تہیہ کر کے جب میں گھر پہنچا تو حسب دستور وہ میرا انتظار کر رہی تھی۔لیکن میرے دیر سے پہنچنے پر اس نے کوئی احتجاج نہ کیا۔شاید اس نے حالات سے سمجھوتہ کر لیا تھا۔مجھے اس پر بے حد پیار آیا۔میں نے کہا۔

''تم میرا انتظار کر کر کے بور ہو جاتی ہو۔کیا کروں، کام ہی اتنا زیادہ رہتا ہے کہ میں وقت پر پہنچ نہیں پاتا۔''میں نے پھر جھوٹ کا سہارا لیا۔

''تم ایسا کرو، کچھ دنوں کے لیے میکے چلی جاؤ۔تھوڑی تبدیلی ہو جائے گی۔''

اس نے غصہ سے میری طرف دیکھا۔

''کیوں؟ کیوں جاؤں میکے؟ یہاں میری غیر موجودگی میں تمھارا خیال کون

کرے گا، کون دھیان دے گا؟ تھکے ماندے گھر آؤ گے تو گرم گرم روٹیاں سینک کر کون کھلائے گا؟ ہوٹل کا کھانا کھا کر تمہاری صحت خراب نہ ہو جائے گی۔"

اسے میں تکتا کا تکتا رہ گیا۔ ادھ سوکھی شاخ کی طرح یہ اوپر سے سخت اور اندر سے کتنی نرم تھی۔ دل میں کتنے نرم جذبے رکھتی تھی۔ شوہر کے تئیں اپنے فرائض، اپنی ذمہ داریوں کی کتنی پابند تھی۔ اس نے مجھے یہ حقیقت تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا کہ بے شک وجودِ زن کائنات کا ایک حسین ترین جزو ہے۔ بشرطیکہ وہ اپنے وجود سے کائنات میں ایسا خوشنما اور پختہ رنگ بھر دے جو کبھی پھیکا نہ پڑے۔

☆☆☆

شناخت

ملک آزاد ہوئے ایک دہائی کا عرصہ گزر چکا تھا لیکن عدم تحفظ کا احساس اب بھی لوگوں کے دلوں میں بنا ہوا تھا۔ کسی کا رخ مغرب کی طرف تھا تو کسی کا مشرق کی طرف۔ کچھ چلے گئے۔ کچھ ڈھیٹ بنے بیٹھے رہے کہ آخر یہی تو ان کا وطن تھا جس پر اُنھیں ناز تھا اور جو شرافت، وضع داری اور بھائی چارہ کی پاسداری کا نمونہ تھا۔ جہاں لوگ ایک دوسرے کے لیے جان کی بازی لگا دیتے تھے۔ گویا ساری خلقت ایک ڈور میں بندھی تھی۔ ہر طرف محبت کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ لیکن اب نفرتوں کے سوا کچھ نہ بچا تھا۔ آپس کی محبت میں دڑاڑ پڑ چکی تھی۔ ملک کے بٹوارے کے ساتھ محبت اور اخوت کا بھی بٹوارہ ہو چکا تھا۔ دوست دوست کا بٹوارہ..... بھائی بھائی کا بٹوارہ ہو چکا تھا۔ لیکن اب بھی کچھ لوگ اس سرزمیں کی مٹی سے لپٹے ہوئے تھے۔ خصوصاً نواب اور زمین دار طبقے کے لوگ جنھوں نے یہاں شاہانہ زندگی گزاری تھی۔ اُنھی میں ایک شخصیت نواب اکبر علی کی بھی تھی۔ انھیں اپنے وطن سے والہانہ پیار تھا جیسے وہ ماں کی آغوش میں بیٹھے

ہوں۔ان کی حویلی اب بھی موجود تھی۔نام نہاد رعب دبدبہ بھی باقی تھا۔چند خدمت گار بھی موجود تھے۔لیکن اب محبت' جاں نثاری' تہذیب' تمیز' ڈر اور خوف ناپید ہو چکا تھا۔ہر ذہن نے باغیانہ رخ اختیار کر لیا تھا۔کوئی کسی سے خود کو کم تر سمجھنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اقدار کی اس پستی نے خیر و برکت کے سائے ختم کر دیے تھے۔بشیرا بھی اسی حویلی کی پیداوار تھا۔جب تھوڑا بڑا ہوا تو پر پرزے نکالنے شروع کیے۔حویلی کے ماحول سے اسے نفرت ہونے لگی تھی۔زیادہ تر وہ حویلی سے باہر بڑے بوڑھوں کے ساتھ رہتا جو حالات حاضرہ پر تبصرہ کرتے رہتے اور ملک کے بٹوارے پر اپنے خیالا کا اظہار کرتے۔جو لوگ یہاں سے چلے گئے انھوں نے کیا پایا اور کیا کھویا کا حساب لگاتے۔بشیرا غور سے ان کی باتیں سنتا رہتا۔حویلی سے زیادہ دیر غائب رہنے پر پرانے ملازموں سے ڈانٹ پھٹکار بھی سنتا۔کبھی کبھی دو چار جھانپڑ بھی کھا جاتا۔نوکروں کا یہ سلوک اسے بہت ہی کھلتا۔ بدلتے ہوئے حالات کے رنگ اس پر بھی اثر انداز ہو چکے تھے۔وہ ماں سے کہتا۔

''اماں! چل پاکستان ۔یہاں میرا دل نہ لگے ہے۔ ہواں آجاد رہیں گے۔کسی کا نوکر بن کے نا۔سب کہے ہیں کہ ہواں جا کے آدمی امیر ہو جاوے ہے۔ سب کے پاس موٹر گاڑی ہو جاوے ہے۔''

ماں نے چونک کر اسے دیکھا۔

''چپ موا! کا کا بولے ہے۔کون تو کو سب سمجھاوے ہے۔تھیر تھمن سے رہ۔ بڑا ہو کے نواب صاحب کا خاص خدمت گار بن جاوے گا۔''

بشیرا اس وقت تو چپ ہو گیا۔لیکن پھر وہی رٹ۔ ماں ہمیشہ سمجھا بجھا کر اسے چپ کرا دیتی لیکن کب تک۔ایک دن موقع پاتے ہی وہ نو دو گیارہ ہو گیا۔ماں رو دھو کر چپ ہو گئی۔یہ تو بعد میں پتہ چلا کہ نور محمد اسے اپنے ساتھ مشرقی پاکستان لے گیا۔اس وقت وہ پندرہ سال کا ہو چکا تھا اور کام کا آدمی بن گیا تھا۔وہاں جمنے کے بعد نور محمد نے

ایک ہوٹل کھولا اور بشیرا کو خوب خوب استعمال کیا۔ وہاں بھی اس کے ساتھ وہی نوکروں والا سلوک تھا جس سے اسے بے حد چڑ ھ تھی ۔ اب وہ پورے بیس سال کا بھر پور جوان تھا لہذا ایک دن نور محمد کو جھانسا دے کر وہ مغربی پاکستان چلا گیا۔ وہاں جاکر اس نے اپنا کاروبار شروع کیا۔ چار پانچ سال کی جان توڑ محنت کے بعد اس کا بزنس بہت آگے چل نکلا۔ وہ مشرقی پاکستان سے جواب بنگلہ دیش بن چکا تھا' پان منگواتا اور کراچی شہر میں دس گنا قیمت پر فروخت کرتا۔ زمانے کے بدلتے ہوئے حالات نے اب نوابوں کی نوابی اور زمین داروں کی رئیسی ختم کر دی تھی ۔ بزرگوں نے تو اپنا وقت کسی طرح گزار لیا لیکن نئی نسل والے باہر کے ممالک میں جا کر اپنی قسمت آزمائی کر رہے تھے ۔نواب اکبر علی کی حویلی ویران ہو چکی تھی ۔ ان کے بھائی نواب جہانگیر علی ابھی حیات تھے۔ان کی بیٹی زبیدہ بیگم پارٹیشن کے وقت ہی پاکستان منتقل ہو گئی تھیں۔

زبیدہ بیگم کی پاکستان میں اچھی پوزیشن تھی ۔ اب ان کی بیٹی کی منسوب کی تلاش تھی ۔ ایک ملاقاتی کی وساطت سے ایک رشتہ طے ہو رہا تھا۔لڑکا کافی پیسہ والا تھا۔ اس کا امپورٹ اکسپورٹ کا بزنس تھا ۔ اپنا بنگلہ تھا' گاڑی تھی ۔ اب اور کیا چاہیے تھا۔ خوشی خوشی بات آگے بڑھی تو لڑکے کو دیکھنے کا مسئلہ پیدا ہوا۔ اس موقع پر زبیدہ بیگم نے اپنے والد نواب جہانگیر علی کو بلوا لیا تھا۔ ایسے موقع پر جہاں دیدہ شخصیت کا ہونا ضروری تھا ۔ لڑکے کے اونر میں کافی انتظام کیا گیا تھا ۔ خاطر تواضع چل رہی تھی ۔ تبھی نواب جہانگیر علی لڑکے سے ملنے وہاں پہنچے۔

ایک نظر دیکھ کر انھوں سوچا لڑکا معقول ہے ۔ ہاں عمر تھوڑی زیادہ ہوگی ۔ یہی کو پینتیس کے لگ بھگ ۔ لیکن جب اُنھوں نے قریب سے دیکھا تو انہیں بیس سال قبل کا بشیرا یاد آ گیا۔

''برخوردار! تمھارا نام کیا ہے۔''

''جی! ناچیز کو بشر الدین کہتے ہیں۔''

بس نواب صاحب کے شک کو تقویت مل گئی۔

''اچھا! یہ تو بتاؤ تمھارا آبائی مکان کہاں ہے، تمھارا حسب نسب کیا ہے، ماں باپ کہاں ہیں؟ شادی کے معاملہ میں یہ سب تفصیل سے معلوم کرنا ضروری ہے۔''

بشیر الدین چکرا گیا۔ اسے تو یہ بھی علم نہ تھا کہ اس کا باپ کون تھا۔ ماں کے بارے میں کیا کہتا۔ اور گھر تو سرے سے کوئی تھا ہی نہیں۔ وہ گول مول جواب دے کر خاموش ہو گیا۔ نواب صاحب نے شہادت کی انگلی سے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''تم بشیرا ہو نا؟ تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی اور یہ جان کر مزید خوشی ہوئی کہ تم اس بلندی پر پہنچ گئے ہو۔ خدا نے چاہا تو زندگی میں اور بھی کامیابی حاصل کرو گے۔ صحیح معنوں میں ملک کا بٹوارہ تمھی جیسے لوگوں کو راس آیا ہے۔''

وہی لہجہ..... انداز بھی وہی تھا۔ رسی جل گئی تھی لیکن اس میں بل اب بھی باقی تھا۔ بشیرا بھی نواب صاحب کو پہچان گیا تھا اور اب اس کی حالت یہ تھی کہ نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن۔ سر جھکائے یہ سوچ رہا تھا کہ انسان چاہے کہیں بھی چلا جائے، کچھ بھی بن جائے اس کا ماضی اس کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ جونک کی طرح دامن سے لپٹا رہتا ہے۔

☆☆☆

دھوپ چھاؤں

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

ناصر کو اچانک اپنے دروازے پر کھڑا دیکھ کر ساختہ میرے ہونٹوں پر یہ شعر آ گیا۔

''اب اندر آنے کے لیے کہو گے یا صرف شعر ہی پڑھتے رہو گے۔''

''ہاں ہاں آؤ اندر آ جاؤ۔ زہے نصیب کہ تم اس غریب خانہ پر تشریف لائے۔ میں نے اپنی حیرت و مسرت پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''کیوں شرمندہ کرتے ہو یار۔ پرانی باتوں کو بھول کیوں نہیں جاتے؟''

''اب تک وہی کوشش تو کر رہا ہوں۔ خیر چھوڑو! یہ بتاؤ اتنے دنوں تک کہاں کہاں گھومے، کیا کیا دیکھا، کیا کیا حاصل کیا؟''

اس نے کوئی جواب دینے کی بجائے چاروں طرف نظریں گھما کر دیکھا۔

''بڑی خاموشی ہے۔کہاں گئے سب لوگ؟''

''سب اپنے اپنے ٹھکانے پر پہنچ گئے۔اماں بھی عارضی قیام گاہ سے منتقل ہو کر دائمی قیام گاہ تک پہنچ گئیں۔کون کب تک کس کا ساتھ دیتا ہے سب نے اپنی اپنی راہ لی۔''

کچھ دیر تک وہ بڑی خاموشی اور حیرت سے ایک ایک چیز کو غور سے دیکھتا رہا۔

''گھر تو بڑا عالیشان بنالیا ہے لیکن اب تک شادی کیوں نہیں کی؟''

''شادی کرنا ضروری ہے کیا؟ مجھے تو کبھی اس کا خیال ہی نہیں آیا۔''

''یہ بھی خوب رہی۔کیسی بیوقوفی کی باتیں کرتے ہو؟ ابھی وقت ہے۔بوڑھے ہو جاؤ گے تو ہزار ڈھونڈنے پر بھی نہ ملے گی۔''

میں نے اس کی باتوں کا کوئی جواب نہ دیا۔بس ایک پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اپنے یہاں آنے کی دعوت دے کر چلا گیا لیکن راکھ کے اندر دبی ہوئی چنگاری کو ہوا دیتا گیا۔جو شعلے بہت مشکل سے سرد ہوئے تھے'وہ پھر سے بھڑک اٹھے۔ان بھڑکتی ہوئی چنگاریوں کی تپش نے مجھے بے چین کر دیا۔میں ماضی کے کھنڈر میں ساری رات بھٹکتا رہا۔ہماری ملاقات اور دوستی کا آغاز اس وقت ہوا جب ہم نے ایک اسکول کے ایک ہی درجہ میں داخلہ لیا تھا۔یہ وہ عمر ہوتی ہے جس میں فرشتوں کی معصومیت بسی ہوتی ہے اور دل و دماغ ہر طرح کی آلودگی سے پاک ہوتے ہیں۔جذبے سچے اور پیارے ہوتے ہیں۔احساس برتری یا احساس کمتری کا کہیں دخل نہیں ہوتا۔کوئی بڑا کوئی چھوٹا نہیں تھا۔سب ایک تھے۔ان بچوں میں ناصر بہت تیزی سے میری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا رہا تھا۔میں بھی خوش دلی سے اسے خوش آمدید کہتا۔میری اس سے خوب پٹنے لگی تھی۔اس طرح ہماری دوستی پروان چڑھتی رہی۔ہم ایک دوسرے کے بہت قریب ہو گئے۔ جب میں کچھ بڑا ہوا تو اپنی اور ناصر کی حیثیت کے فرق کا ادراک ہوا۔دھیرے دھیرے بہت ساری باتیں سمجھ میں آنے لگیں۔میں اکثر محسوس کرتا کہ دوستی میں

اب وہ پہلے جیسی گرم جوشی نہ رہی تھی۔اب ناصر کے اندر اپنے ذی حیثیت ہونے کا غرور پیدا ہو گیا تھا۔ وہ ہمیشہ غریبوں کی تحقیر اور تضحیک کرتا رہتا۔اس کی یہ بات مجھے ذرا بھی نہیں بھاتی۔ہم دونوں کے نظریے میں بہت تضاد تھا۔میں اسے سمجھاتا۔

''دیکھو ناصر! غریبوں کے تئیں اپنا رویہ بدلو۔کسی کو خود سے کم تر سمجھنا انسانیت کی توہین ہے۔برتری دولت سے نہیں اپنے عمل اور کردار سے پیدا ہوتی ہے۔دولت جمع کر کے اس پر اترانے سے بہتر ہے کہ نیک نامی جمع کی جائے۔''

وہ میری بات پر بدک جاتا۔

''تمھارا یہ فلسفہ میرے پلے نہیں پڑتا۔بہتر ہے کہ تم ان کی زیادہ حمایت نہ کرو۔ وہ اسی لائق ہیں۔انہیں جتنا سر چڑھاؤ گے اتنا ہی وہ تمھیں پاؤں کے نیچے روندیں گے۔''

کبھی کبھی یہ موضوع اس قدر سنجیدہ صورت اختیار کر لیتا کہ میں ان دنوں کو یاد کرنے لگتا جب ناصر کے دل میں یہ طبقاتی امتیاز پیدا نہ ہوا تھا۔یہ سچ ہے کہ جب میں پہلی بار اس کے گھر گیا تھا تو وہاں کا ٹھاٹ باٹ اور بنگلہ گاڑی دیکھ کر میری آنکھیں چکا چوند ہو گئی تھیں۔میں اپنے آپ کو بہت ہی چھوٹا اور کمتر محسوس کرنے لگا تھا۔حالانکہ مجھے اس بات کی صداقت پر پورا یقین ہے کہ دولت سے زیادہ بے وفا اور بے اعتبار شے اور کوئی نہیں۔یہ تو دھوپ چھاؤں ہے۔کبھی ادھر تو کبھی ادھر۔پھر بھی میری یہ فیلنگ' یہ احساس کمتری انسانی فطرت کا تقاضہ تھی۔اس وقت مجھے اپنے بزرگوں کا یہ قول یاد آ گیا کہ دوستی اپنے برابر والوں سے ہی رکھو۔خود سے نیچے کی طرف دیکھنے والے مغرور ہو جاتے ہیں اور اوپر کی طرف دیکھنے والے ہمیشہ احساس کمتری میں مبتلا رہتے ہیں۔بہر کیف! میرا اپنا قول یہ ہے کہ جب دوستی کا ہاتھ تھاما تو آخری دم تک اسے بہ حسن خوبی نبھاؤ۔اسی نقطۂ نظر کے تحت میں نے ناصر سے اپنی دوستی برقرار رکھی۔میں اکثر اس کے

گھر بھی جاتا۔ وہاں اندر تک میری رسائی تھی۔ گھر کے ہر فرد سے میں بے تکلف ہو گیا تھا۔ ناصر کا رویہ میرے ساتھ واجب واجب سا تھا۔ کسی طرح لشٹم پشٹم ہماری دوستی کی گاڑی چل رہی تھی۔ لیکن پھر کچھ ہی دنوں بعد ہمارے راستے بالکل الگ ہو گئے۔ اب اس کا زیادہ وقت دادا گیری اور نیتا گیری میں گزرتا۔

اپنی پڑھائی پوری کرنے کے بعد میں زیادہ دنوں تک بیکار نہیں رہا۔ بہت جلد مجھے جاب مل گئی۔

جب ناصر کی بہن کے رشتے کی تلاش جاری تھی تو ہمارے گھر والوں نے بھی پیغام بھجوایا جسے اس نے بڑی حقارت سے رد کر دیا۔

''ہنہ! چلے آتے ہیں لوگ مقابلہ میں۔ اپنی اوقات بھول جاتے ہیں۔ تھوڑا پڑھ لکھ کیا لیتے ہیں اپنے آپ کو نہ جانے کیا سمجھنے لگتے ہیں۔ ابھی میں اتنا گیا گزرا نہیں ہوں کہ ان کنگالوں سے رشتہ جوڑوں۔''

کہتے ہیں کہ بات ہونٹوں نکلی کوٹھوں چڑھی۔ کسی نہ کسی طرح یہ خبر مجھ تک پہنچ گئی جس نے میری عزت نفس کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ میں اپنے بارے میں کسی خوش فہمی کا شکار نہ تھا۔ میری شخصیت میں کوئی ایسی بات نہ تھی کہ کوئی آنکھیں بند کر کے میرے حق میں فیصلہ دے دیتا۔ لیکن اتنا گیا گزرا بھی نہ تھا کہ اس قدر تحقیر آمیز جملے استعمال کیے جائیں۔ مجھے خود کے ٹھکرائے جانے کا اتنا دکھ نہ تھا جتنا اس مان، اس اعتماد کے ٹوٹ جانے کا تھا جو عرصہ سے ہم دونوں کے بیچ قائم تھا۔ امارت نے مجھے شکست دے کر پیار و محبت کا خزانہ لوٹ کر صحیح معنوں میں مجھے کنگال کر دیا تھا۔

کہتے ہیں کہ دشمن سامنے سے وار کرتے ہیں اور منافق دوست پیچھے سے چھپ کر۔ لیکن اس نے تو حد ہی کر دی تھی۔ سارا لحاظ خیال بالائے طاق رکھ کر سامنے سے ہی وار کیا تھا۔ اور وار بھی اتنا کاری کہ میں تلملا کر رہ گیا تھا۔ لہٰذا اس کے بعد پھر اس

سے ملاقات نہ ہو سکی۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ بیرون ملک چلا گیا ہے اور اب اتنے دنوں بعد جب میں ان ساری تلخ یادوں کو دفن کر چکا تھا' وہ گڑے مردے اکھاڑنے اور میرے مندمل ہوتے ہوئے زخم کو کریدنے آ پہنچا تھا۔ اس کی آمد کا سلسلہ پھر سے شروع ہو گیا تھا۔ وہ تقریباً ہر دوسرے تیسرے دن آ جاتا۔ کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کر کے چلا جاتا لیکن میں نے ہر بار یہ محسوس کیا کہ وہ کوئی خاص بات کرنا چاہتا ہے۔

''کچھ پریشان سے لگتے ہو''۔ اس کی بے چینی دیکھ کر آخر ایک دن میں نے پوچھ ہی لیا۔

''ہاں! تمھارا اندازہ صحیح ہے۔ میں ایک بڑی آزمائش میں گھر گیا ہوں۔''

زبان سے اس نے صرف اتنا ہی کہا۔ لیکن اس کی آنکھیں کچھ اور بھی کہہ رہی تھیں۔ ان آنکھوں میں شرمندگی' پشیمانی' التجا اور کچھ طلب کے جذبے دکھائی دے رہے تھے۔ میں حیران تھا۔ وہی میں ہوں' وہی وہ ہے۔ سب کچھ وہی تھا لیکن اس کا روپ بدلا ہوا تھا۔ شاید وقت کی گردشیں' زمانے کے تغیرات' انسان کے اندر اتنی تبدیلیاں پیدا کر دیتے ہیں کہ چہرے بدل جاتے ہیں۔ خیالات بدل جاتے ہیں' انداز بدل جاتا ہے۔ ابھی میں غور و فکر میں ڈوبا ہوا تھا کہ اس نے پھر کہنا شروع کر دیا۔

''اس کمینے نے میری عزت داؤ پر لگا دی ہے۔''

''کس نے؟' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''میری بہن کے شوہر نے طلاق کی نوٹس بھجوا دی ہے۔''

☆☆☆

خوشبو

وہ پہلی بار مجھے ہل اسٹیشن پر ملی تھی۔ میں سیر و سیاحت کا بڑا رسیا ہوں۔ اکثر چھٹیاں کسی ہل اسٹیشن پر گزارتا ہوں۔ اگر کوئی ساتھی مل گیا تو سونے پر سہاگا ورنہ تنہا ہی نکل پڑتا ہوں۔ اس شوق کی بدولت میں نے کئی ہل اسٹیشن دیکھے لیکن نینی تال کے صاف ستھرے پرسکون اور پرفضا مقام نے مجھے بہت ہی ایٹریکٹ کیا۔ نینی تال جانے کا میرا یہ دوسرا اتفاق تھا۔

میں روزانہ صبح و شام مال روڈ کی سیر کو نکل جاتا۔ اس روز بھی میں جھیل کے کنارے قدرت کے حسین مناظر سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ شام کے سرمئی اندھیرے ہر طرف پھیل رہے تھے۔ دن بھر کا تھکا ماندہ سورج لال گولے کی شکل میں آسمان پر لالی بکھیرتا ہوا پہاڑ کے دامن میں اترتا چلا جا رہا تھا۔ مال روڑ کے ایک طرف پہاڑ پر بنا ہوا ریسٹ ہاؤس کا لامتناہی سلسلہ برقی قمقموں سے جگمگا اٹھا۔ دوسری طرف جھیل میں رنگ برنگی چھوٹی چھوٹی کشتیاں پانی کی سطح پر بطخ کی طرح تیرتی ہوئی بھلی لگ رہی تھیں۔ میں ان مناظر میں کھویا ہوا تھا کہ عقب سے ایک نسوانی آواز ابھری۔

میں نے پلٹ کر دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ قدرت کے کس کس شاہکار کو داد تحسین دوں میں نے کہا

''فرمائیے۔'' وہ شاید اپنی روداد سنانے کے لیے بے چین تھی لہذا بغیر تمہید کے ہی شروع ہوگئی۔

''بات یہ ہے کہ ہمارے کالج کی طرف سے پکنک کے لیے ٹیم آئی ہوئی ہے۔ میں بھی اس میں شامل ہوں۔ آج میں تنہا ہی سیر کے لیے نکل پڑی اور قدرت کے ان دلفریب نظاروں میں کھوئی ہوئی آگے بڑھتی رہی۔ جب اندھیرا چھا گیا تو مجھے احساس ہوا کہ میں کافی دور نکل آئی ہوں۔ اب تنہا واپس جاتے ہوئے خوف آرہا ہے۔ پلیز آپ میری مدد کریں۔ رسٹ ہاؤس تک میرے ساتھ چلیں۔''

میں سوچ میں پڑ گیا ایا یہ سچ کہ رہی ہے یا فراڈ کر رہی ہے۔ میں نے کہا۔

''کیا آپ مردم شناسی کا فن جانتی ہیں یا میری پیشانی پر لکھا ہے کہ میں ایک شریف اور بے ضرر انسان ہوں؟ میں محافظ کے بجائے راہزن بھی بن سکتا ہوں۔'' وہ سر جھکائے شرمندہ سی کھڑی تھی۔ اس نے کہا۔

''مجھے مردم شناسی کا علم تو نہیں ہے لیکن میرا دل کہہ رہا ہے کہ آپ ایک اچھے انسان ہیں۔''

''ایسی بات ہے تو چلئے۔ میں آپ کے دل کی آواز پر لبیک کہتا ہوں۔''

اور میں اس کا محافظ بن کر اس کے ساتھ ہولیا۔ واقعی وہ کافی دور نکل آئی تھی۔ ریسٹ ہاؤس پہنچ کر اس نے میرا شکریہ ادا کیا اور ایک کپ چائے اپنے ساتھ پینے کا آفر دیا لیکن میں معذرت کر کے واپس آ گیا۔ اس نے اپنا نام خوشبو بتایا تھا۔ خوشبو میرے جسم وجاں کو مہکاتی رہی۔ سوتے جاگتے میرے اردگرد خوشبو پھیلاتی رہی۔ لیکن پھر دوبارہ وہاں اس سے ملنے کا موقع نہ ملا۔

خوشبو

جب میں اس سے دوسری بار ملا تو اس کی شخصیت بالکل منفرد تھی۔ ماحول بھی مختلف تھا۔ میں اپنے دوست وسیم صدیقی کی برتھ ڈے پارٹی میں گیا تھا۔ وہاں جانے کا یہ میرا پہلا اتفاق تھا۔ وسیم سے میری کوئی دیرینہ دوستی نہ تھی لیکن بہت جلد ہم دونوں ایک اچھے دوست بن گئے تھے۔ خوشبو اس کی بہن تھی۔ وہیں میں نے اسے دوبارہ دیکھا تھا۔ دوپٹہ کے ہالہ میں اس کا چہرہ چودھویں کی چاند کی طرح دمک رہا تھا۔ میں دیر تک وہاں رہا۔ اس توبہ شکن حسن کے سامنے سے ہٹنے کو بھلا کس کافر کا دل چاہتا۔

اس روز ساری رات خوشبو میرے خوابوں میں آتی رہی۔ میرے دل کے آنگن میں خوشبو پھیلاتی رہی۔ اب یہ دل ناہنجار ہر وقت اس کے دیدار کا مشتاق رہتا۔ لیکن میں کوئی مجنوں کی اولاد تو تھا نہیں جو گریباں چاک کر کے اس کے در پر پہنچ جاتا۔ ہاں کبھی حیلے بہانے تراش کر وہاں ضرور چلا جاتا لیکن رعب حسن اور رعب امارت منہ کھولنے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ میں نے کئی بار وسیم سے اپنا مدعا بیان کرنا چاہا بلکہ ہر روز میں یہی سوچ کر اس سے ملتا لیکن بات زبان تک آ کر واپس ہو جاتی کہ کہاں وہ اور کہاں میں۔ میں ٹھہرا ایک ادنیٰ اور نادار شخص۔ منہ نہ کھولنے میں ہی عافیت تھی لیکن دل نادان کے تقاضے عجیب عجیب تھے۔ گھر چھوڑ دو، شہر چھوڑ دو، ملک چھوڑ دو اور اگر ہو سکے تو دنیا ہی چھوڑ دو۔ لیکن دنیا چھوڑنے کا یارا نہ تھا۔ دین و دنیا میں ذلیل و خوار ہونا گوارا نہ ہوا تھا۔ البتہ ملک چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ وسیم نے سنا تو مجھ پر برس پڑا۔

''یہ کیا بے وقوفی ہے؟ یہ کون سا بھوت تمہارے سر پر سوار ہوا ہے؟'' اب میں کیا کہتا کہ یہ بھوت تمہاری بہن کے عشق کا ہے۔ ابا اماں نے بہت سمجھایا۔ چلے جانا پہلے اپنی تعلیم تو مکمل کر لو۔ لیکن دل حزیں نے کسی کی ایک نہ سنی۔ خدا کا شکر تھا کہ باہر مجھے ایک اچھی سی جاب مل گئی۔ دل بیقرار کو قرار آ گیا۔ لیکن خوشبو کی یاد دل سے محو نہ ہو سکی۔ کبھی اس کی یاد درخشاں ستارہ بن کر ذہن کے پردے پر جگمگاتی اور کبھی مایوسیوں کی

عمیق ترین گہرائیوں میں ڈوب جاتی ۔ غرض دو سال تک میں مایوسیوں کے سمندر میں ڈوبتا اور ابھرتا رہا۔ دو سال بعد جب واپس آیا تو وسیم سے ملے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ مجھ سے بڑی گرم جوشی سے ملا اور خوشبو کی شادی کا مژدہ سنایا۔ دل پر ایک بجلی سی گری۔ میں اس ساعت کو کوس رہا تھا جب میں نے یہاں آنے کا پروگرام بنایا تھا۔ لیکن اب راہ فرار مسدود تھی۔ شادی کی تیاریوں میں وسیم نے مجھے بھی شامل کر لیا اور میں اپنے دل پر صبر کی سلی رکھ کر اس کا ہاتھ بٹاتا رہا۔ شادی بہت ہی امیر ترین گھرانے میں ہونا قرار پائی تھی۔ لڑکا اعلیٰ تعلیم یافتہ تھا۔ بڑی ایڈوانس فیملی تھی۔ گویا پلڑا برابر کا تھا۔ ظاہر ہے مخمل میں مخمل ہی کا پیوند زیب دیتا ہے۔ شادی کے روز مجھے آنے میں دیر ہو گئی۔ بارات آ چکی تھی۔ عقد کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ میں گفٹ کا پیکٹ ہاتھ میں لیے ہوئے وسیم کو تلاش کر رہا تھا تبھی منچ کی طرف سے شور وغل کی آواز آئی ۔ میں پیکٹ ایک طرف رکھ کر دوڑ پڑا۔ دونوں فریقوں میں کسی بات پر ناچاقی ہو گئی تھی۔ لڑکے والے ہاتھ ہلا ہلا کر غصے کا اظہار کر رہے تھے۔ لڑکی والے ہاتھ جوڑے کھڑے تھے۔ کچھ لوگ دونوں میں تصفیہ کرانے کی کوشش کر رہے تھے۔ لیکن دیکھتے ہی دیکھتے پنڈال خالی ہو گیا۔ وسیم نے میرا ہاتھ پکڑا اور ایک طرف لا کر کہا۔''

''تمہیں میرا ایک کام کرنا ہوگا۔''

''تم کہو کیا کام ہے؟''

''تم ابھی اور اسی وقت خوشبو سے عقد کر لو۔'' اور یہ سنتے ہی کسی انجانی خوشبو میرا وجود مہک اٹھا۔

☆☆☆

دادی اماں کی کہانی

ہم سب بچے دادی اماں کو گھیرا ڈالے ان سے کہانی کی فرمائش کر رہے تھے۔ وہ روز ہمیں کہانی سناتی تھیں۔ کبھی طوطا مینا کی تو کبھی دیو اور پری کی اور کبھی کچھ اور۔

''دادی اماں! دادی اماں!! آج ہمیں طوطا مینا کی کہانی نہیں سننی۔'' سب بچوں نے کورس میں کہا۔

''تو پھر کون سی کہانی سننی ہے؟''

''آج ہمیں راجا کی کہانی سنایئے۔''

''ٹھیک ہے' آج میں تم لوگوں کو راجا کی کہانی ہی سناتی ہوں۔''

کچھ دیر سوچنے کے بعد دادی اماں نے کہانی کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

''کہنے والا جھوٹا اور سننے والا سچا۔ ایک ملک میں ایک بادشاہ تھا۔''

''ہاہاہا۔ دادی اماں! آپ نے تو خود کو ہی جھوٹا بنا دیا۔'' بچوں نے قہقہہ لگایا۔

''ارے نہیں بچو! میں بھی تو سنی سنائی کہہ رہی ہوں۔ اپنی آنکھوں سے تھوڑے

ہی دیکھا ہے۔ اچھا اب خاموش رہو! اگر بیچ میں سوال کیا تو پھر میں کہانی نہیں سناؤں گی۔''

''ٹھیک ہے! ٹھیک ہے!! اب ہم لوگ کوئی سوال نہیں کریں گے۔''

بچوں نے کان پکڑ کر توبہ کی۔

''ہاں تو ایک ملک میں ایک بادشاہ تھا۔ وہ بہت ہی شاطر' ظالم اور لالچی تھا۔ سارے لوگ اس سے تھر تھر کانپتے تھے۔ گاہے گاہے وہ چھوٹے چھوٹے بادشاہوں کو اپنے ظلم کا نشانہ بناتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ پوری دنیا میں اس کا پرچم لہرائے۔ اس کی زیرک نگاہیں تاک میں رہتیں کہ کہاں کون سی چیز اس کے فائدہ کی ہے اور کیسے اسے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اس کا شیطانی دماغ طرح طرح کے منصوبے بناتا رہتا۔ پہلے چارہ ڈالتا پھر مچھلی کو اپنے جال میں پھانستا۔ وہ چال چلنے میں بڑا ماہر تھا۔ پہلے دو ملکوں کو آپس میں لڑوا دیتا۔ پھر جب وہ ٹوٹ جاتے تو ان کی مدد کے لیے آگے آجاتا۔ محافظ بنا کر اپنے سپاہیوں کو اس ملک میں تعینات کر دیتا اور خزانے پر اپنا قبضہ لیتا۔ پھر موقع پاتے ہی کسی اور ملک پر چڑھائی کر دیتا اور اسے تباہ کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑتا۔ معصوم لوگ اس کی بربریت کا شکار ہوتے رہتے لیکن کوئی دوسرا بادشاہ ان کی مدد کے لیے آگے نہیں آتا کیونکہ وہ تو خود دبکا ہوا اپنی ہی خیر مناتا رہتا۔ یہ ان لوگوں کی بزدلی تھی یا مصلحت..... جو بھی ہو..... ان کی یہی کمزوری اس ظالم بادشاہ کو بڑھاوا دے رہی تھی۔ اگر کئی ملک مل کر اس کی مخالفت کرتے اور ہمت سے کام لیتے تو اس ظالم بادشاہ کو اپنی طاقت کا بے جا استعمال کرنے کی ہمت نہ ہوتی۔ اسی بات پر بچو! آؤ میں تمہیں ایک اور کہانی سناتی ہوں۔ ایک شخص کو چار بیٹے تھے۔ جب وہ بوڑھا اور قریب المرگ ہو گیا تو اس نے اپنے بیٹوں کو پاس بلایا اور نصیحت کرتے ہوئے کہا۔ دیکھو تم لوگ آپس میں مل جل کر رہنا۔ کبھی لڑائی جھگڑا نہ کرنا۔ اگر تم لوگوں کی آپس میں نااتفاقی رہے گی تو دوسرے اس سے فائدہ اٹھائیں گے۔ اس نے مثال دینے کے لیے لکڑی کا ایک گٹھر منگوایا۔ پھر باری باری

سبھوں کو اسے توڑنے کے لیے کہا لیکن کوئی بھی کامیاب نہ ہو سکا۔ پھر اس بوڑھے شخص نے گٹھر کھول دیا اور ساری لکڑیوں کو لڑکوں میں بانٹ دیا اور انھیں ایک ایک کر کے لکڑیاں توڑنے کے لیے کہا۔ سبھوں نے یہ آسان کام کر دیا۔ پھر اس بوڑھے نے اپنے بیٹوں سے کہا کہ اگر تم لوگ آپس میں اتحاد رکھو گے تو تمہارا کوئی دشمن تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا ہے۔ اب بچو! تم بتاؤ کہ ان چھوٹے چھوٹے ملکوں بادشاہوں کو کیا کرنا چاہیے تھا؟''

''سب کو ایک جٹ ہو کر اس ظالم بادشاہ کا سر کچل دینا چاہیے تھا۔'' بچوں نے جوشیلے لہجے میں کہا۔

''لیکن کیسے؟'' سب بچے خاموش رہے۔

''اچھا! اس کا جواب سوچ کر کل مجھے دینا۔'' لیکن کسی بچے کو کوئی جواب نہ سوجھا اور دادی اماں کی کہانی ادھوری رہ گئی۔

اس بات کو کافی عرصہ گزر گیا۔ لیکن آج مجھے اس کا جواب مل گیا ہے۔ دادی اماں نے تو سنی سنائی کہی تھی لیکن آج میں سب اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی ہوں اور اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ کوئی بھی طاقت خدا کے حکم کے بغیر کسی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ آج دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے سب خدا کے حکم اور اسی کی منشا سے ہو رہا ہے۔ یہ قوم جس کا رتبہ سب سے بلند تھا' جو امتوں میں سب سے افضل تھی' وہ آج ہر طرف ذلت اور رسوائی کی کھائی میں گرتی جا رہی ہے کیوں کہ وہ اپنے راستے سے بھٹک گئی ہے' بے راہ روی اختیار کر چکی ہے۔ خدا اور اس کے رسول کی نافرمانی کر رہی ہے اور اسی کا خمیازہ بھگت رہی ہے۔ اگر اب بھی یہ قوم راہ راست پر نہ آئی تو وہ دن دور نہیں کہ اس کا حشر بھی وہی ہونے والا ہے جو لوط اور نوح علیہ السلام کی قوم ہوا تھا۔

☆☆☆

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے

رات بہت تاریک اور سرد تھی ۔ ایک کمزور اور نحیف خاتون بستر پر پڑی کسی سوچ میں گم تھیں لیکن ان کے کان ٹیلیفون کی گھنٹی کی طرف لگے ہوئے تھے۔انھیں اپنے بیٹے کا فون کا انتظار تھا۔اس کی آواز سننے کے لیے ان کے کان ترس رہے تھے۔ نہ جانے کب سے سارا دن اور رات کے ابتدائی حصے میں یہ انتظار روز کا معمول بن گیا تھا۔کبھی کبھی وہ گھوم کر فون کی جانب دیکھ بھی لیتیں ۔ انھیں لگتا آواز کے ساتھ بیٹے کی شکل بھی سامنے آ جائے گی ۔ حالانکہ سائنس نے اس انہونی کو ممکن کر دکھایا ہے مگر انٹیرنیٹ ابھی ان دسترس سے دور تھا۔ دس سال کا طویل عرصہ گزر چکا تھا اسے دیکھے ہوئے ۔اور اب تو وقت کی گردش نے اس کی شبیہہ پر بھی دھند کی چادر ڈال دی تھی ۔ انتظار کی طوالت سے گھبرا کر یہ شعر ان کے ہونٹوں پر آ جاتا:

عمر دراز مانگ کے لائے تھے چار دن
دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں

جب وہ بیاہ کر سسرال پہنچیں تو زمین درای کا خاتمہ ہو چکا تھا لیکن اس کی بو باس ابھی باقی تھی۔ لوگوں میں دم خم برقرار تھا اور سفید پوشی کا بھرم قائم تھا۔ گھر میں نوکر چاکر بھرے تھے۔ شوہر زیادہ تعلیم یافتہ نہ تھے۔ بچی کھچی تھوڑی بہت جائداد کی دیکھ ریکھ کرتے۔ زندگی خوش گوار گزر رہی تھی البتہ فکر اس بات کی تھی کہ شادی کے کئی سال بعد بھی آرزو کے چمن میں کوئی پھول نہ کھلا تھا۔ ساس سسر تشویش میں مبتلا ہو گئے۔ پھر تعویز' گنڈے' پیر فقیر اور درگاہوں کا سہارا لیا گیا۔ اس کے بعد ڈاکٹروں کے چکر لگائے گئے۔ لیکن کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی۔ اور جب وہ لوگ بالکل مایوس ہو گئے تو اچانک دس برس بعد رحمت خداوندی جوش میں آئی اور ان کے دل کے گلشن میں ایک خوبصورت پھول کھل اُٹھا۔ ماں باپ' دادا دادی کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ دادا نے اس کا نام رحمت اللہ رکھا اور دونوں ہاتھوں سے خیرات لٹائی۔ جب اس نے بڑوں کی انگلیاں پکڑ کر چلنا سیکھا تو ان کے دل کی کلی کھل گئی۔ جب وہ چار سال کا ہوا تو بڑی دھوم دھام کے ساتھ اس کا مکتب کیا گیا۔ پھر بڑھتی ہوئی عمر کے ساتھ ساتھ اس کی تعلیم کا سلسلہ بھی چلتا رہا۔ اخراجات بڑھتے گئے اور معاشی حالات بگڑتے گئے۔ اب پہلے جیسی فراغت نہیں رہی تھی۔ کھینچ تان کر زندگی کی ضروریات پوری ہوتیں۔ جب رحمت اللہ آٹھویں جماعت میں پہنچا تو دادا دادی یکے بعد دیگرے اس جہان فانی سے کوچ کر گئے۔ حویلی ویران ہو گئی۔ نوکر چاکر بھی دھیرے دھیرے کھسکنے لگے۔ ان کی قوم ہی چینٹوں کے مانند ہوتی ہے۔ جہاں مٹھاس کم ہوئی ان لوگوں نے اپنا راستہ بدل لیا۔ وہ تو نندوں نے کرم کیا کہ اپنے حصے کا مطالبہ نہیں کیا۔ حویلی کے اردگرد جو خلوتیں تھیں انھیں بھی کرایہ پر لگا دیا گیا۔ اس طرح کچھ آمدنی بھی ہونے لگی اور ان کی تنہائی بھی کسی حد تک کم ہو گئی۔

وقت اپنی رفتار سے چل رہا تھا۔ زمانے کے سرد و گرم اس کی رفتار پر اثر انداز نہیں ہوتے' ہاں زندگیاں اس کے درمیان پسپا ہوتی رہتی ہیں۔ لیکن جو جتنی زندگی

لے کر آیا ہے اسے اتنا ہی جینا ہے اور جو قسمت میں لکھا ہے اسے پورا تو ہونا ہی ہے۔

باوجود تنگی کہ رحمت نے بی کام پاس کرلیا۔ والدین کا سینہ گز بھر چوڑا ہو گیا۔

پھر ایک ایسی ہوا چلی کہ نوجوانوں کے سر پر باہر جانے کا سودا سوار ہونے لگا کوئی گلف کی جانب جا رہا ہے تو کوئی امریکہ۔ رحمت اللہ کے دل میں بھی امریکہ جانے کی خواہش مچلنے لگی۔ اس کے کئی دوست وہاں جانے کے لیے پر تول رہے تھے۔ اس نے بھی اپنے والدین سے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ وہ دم بخود رہ گئے۔ جس بیٹے کی جدائی اُنھیں ایک دن بھی گوارا نہ تھی وہ سات سمندر پار جانے کی بات کر رہا تھا۔ اُنھوں نے اسے سمجھانے کی بڑی کوشش کی، اپنی تنہائی اور بڑھاپے کا واسطہ دیا لیکن اس کے سر پر تو وہاں جانے کا جنون سوار تھا۔ وہ خاموش رہ گئے۔ وہ کوئی جانور تو تھا نہیں کہ جسے کھونٹے سے باندھ کر رکھا جاتا، نہ وہ کوئی چھوٹا بچہ تھا جسے ڈانٹ ڈپٹ کر چپ کرا دیا جاتا۔ وہ تو جوان، باشعور اور باصلاحیت انسان تھا جو اپنا اچھا برا خوب سمجھتا تھا۔ وہ یہ سوچ کر خاموش رہ گئے کہ ہم کیوں اس کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ بنیں؟ شاید خدا کو یہی منظور ہے۔ ایک دور کے رشتہ دار نے گرین کارڈ کے بدلے اسے اپنی فرزندی میں لے لیا۔

روانہ ہوتے وقت رحمت اللہ نے اپنے والدین کو دلاسہ دیا کہ وہ ہر سال ملنے کے لیے آتا رہے گا اور موقع ملتے ہی ان لوگوں کو اپنے پاس بلا لے گا۔ لیکن یہ سب تو بس کہنے سننے کی باتیں ہیں۔

والدین نے بڑے صبر و تحمل کے ساتھ بیٹے کو رخصت کیا۔ ان دعاؤں کے ساتھ:

"بیٹا جہاں رہو خوش رہو اور ترقی کی اس بلندی تک پہنچو جہاں سے خدا نہ کرے کبھی تمھیں پلٹ کر نیچے دیکھنے کی ضرورت پیش آئے۔ ہمارا کیا ہے۔ ہم تو یہیں خوش ہیں۔ یہی ہمارا وطن ہے۔ یہاں ہمارے آبا و اجداد کی ہڈیاں دفن ہیں۔ فضاؤں میں ان کی

خوشبو رچی بسی ہے۔اس سرزمین پر ہماری عظمتوں کے نشانات ابھی باقی ہیں۔''

پھر اُنھوں نے بیٹے کو سینے سے لگا کر دھندلائی آنکھوں سے اسے الوداع کہا۔

دو سال بعد جب وہ وطن لوٹا تو ان کی آنکھوں کی بینائی جیسے لوٹ آئی ہو۔وہ دو ماہ کے لیے آیا تھا اور دو ماہ پلک جھپکتے ہی ختم ہو گئے۔اسے جلدی واپس جانا تھا کیونکہ ابھی تک اسے وہاں کوئی مناسب جاب نہیں ملی تھی۔ابھی اسے بہت جدو جہد کرنا تھا۔کئی کورسیس کرنے تھے۔کئی امتحاناتِ سے گزرنا تھا۔جاتے وقت اس نے کہا تھا کہ اب شاید جلد نہ آسکوں۔

وہ چلا گیا۔

شروع شروع میں تو اس کے خطوط برابر آتے رہے۔لیکن پھر دھیرے وقفہ بڑھنے لگا۔وہی وقت کی کمی اور اپنی مصروفیتوں کا رونا۔پھر اس کے خطوط آنے بند ہو گئے۔وہاں خط لکھنے کی فرصت ہی کسے ملتی ہے۔ہاں کبھی کبھار اس کا فون آجاتا۔اب اسے ایک اچھی اور پرمانینٹ جاب مل گئی تھی اور وہ کافی روپیہ حاصل کر رہا تھا۔لیکن اس نے بتایا کہ وہاں کوئی چاہے جتنا بھی حاصل کر لے اس کا ہاتھ ہمیشہ تنگ ہی رہتا ہے۔ وہاں دنیا کی ہر آسائش میسر ہے لیکن وہاں ہر شخص ہمیشہ حکومت کا مقروض رہتا ہے۔

اپنے خرچ سے بچا بچا کر کبھی کبھار وہ تھوڑی بہت رقم بھیج دیا کرتا۔لیکن والدین کے لیے اس کا یہ عمل باعث تسکین نہ ہوتا۔یہاں ان کی جو آمدنی تھی وہ ان دو نفوس کے لیے کافی تھی۔ان کی گزر بسر مزے سے ہو رہی تھی۔لیکن خدا کو نہ جانے اور کتنی آزمائشیں منظور تھیں۔

ان کے شوہر اچانک گزر گئے۔

یہ سانحہ ان کے لیے نا قابلِ برداشت تھا۔اس موقع پر ان کا بیٹا بھی ان کے آنسو پوچھنے کے لیے نہ آسکا۔کچھ ایسی بندشیں تھیں کہ وہ چاہ کر بھی مجبور تھا۔پوری حویلی

میں وہ تنہا رہ گئی تھیں۔صرف فون کا سہارا تھا جو بیٹے کے یہاں سے اکثر آ جاتا تھا۔لیکن ادھر کچھ دنوں سے یہ سلسلہ بھی بند تھا۔وہ بیٹے کی آواز سننے کے لیے تڑپ رہی تھیں۔یوں تو ہر روز رات کے آخری پہر نیند کی دیوی انھیں اپنی آغوش میں لے لیا کرتی تھی مگر آج کچھ عجیب سی بے چینی ہو رہی تھی۔سینے میں جلن ہو رہی تھی۔حلق خشک ہو رہا تھا۔وہ سوتے وقت اپنے سرہانے پانی کا مگ اور گلاس ضرور رکھتی تھیں۔انھوں نے گلاس اُٹھانے کے لیے جیوں ہی ہاتھ بڑھایا ان کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ہاتھ پلنگ کی پٹی سے جھول کر رہ گیا۔

محلے والوں نے انھیں ان کی آخری قیام گاہ تک پہنچایا۔

حویلی ویران ہوگئی۔چند قریبی رشتہ داروں نے اس پر قبضہ کرلیا۔

پتہ نہیں کسی نے ان کے بیٹے کو اس سانحے کی خبر دی یا نہیں؟

☆☆☆

صاف چھپتے بھی نہیں

''سنئے۔''

''جی فرمائیے۔''

''ایسا لگتا ہے جیسے میں نے آپ کو پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔''

''کہاں؟ کب؟؟؟''

''چھوڑ یئے! یہ جاننا کیا ضروری ہے کہ میں نے آپ کو کب اور کہاں دیکھا ہے۔ یہ کیا کم ہے کہ آپ میرے سامنے جلوہ افروز ہیں۔ آپ کی مترنم آواز کانوں میں رس گھول رہی ہے۔آپ تو مجسم غزل ہیں جس میں ڈوب جانے کو دل چاہتا ہے۔اب برائے مہربانی اپنا اسم گرامی بتا دیجئے۔''

''کہیں آپ کا دماغ تو خراب نہیں۔''

''ابھی تو نہیں ہے لیکن ہو جائے گا اگر آپ یوں ہی کتراتی رہیں اور مجھے یہ کہنے پر مجبور کرتی رہیں کہ صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں۔

''بکواس بند کیجئے اور میرا راستہ چھوڑیئے۔

''کیوں خفا ہوتی ہیں۔ چلی جایئے گا بیشک چلی جایئے گا لیکن دو باتیں تو کرتی جایئے۔ یہ ناراض ہونے والی کون سی بات ہے؟ ایسا ہی ہوتا ہے۔ جب عشق کا بھوت سر پر سوار ہوتا ہے تو جی چاہتا ہے کہ گریباں چاک کر کے جنگل میں نکل جاؤں۔ اور یہ دل بے چارہ تو ایک نظر التفات کا خواہاں ہے۔''

''آپ ہٹیں گے یا بلاؤں پولس کو؟''

''نہ! نہ!! نہ!!! ایسی غلطی نہ کیجئے۔ کیوں زحمت کرتی ہیں۔ دیکھئے مجھے غلط نہ سمجھئے۔ میں کوئی لچا لفنگا نہیں ہوں۔ بس کبھی کبھی مجھے عشق کا نزلہ ہو جایا کرتا ہے۔

''راہ چلتی شریف لڑکیوں کو چھیڑتے ہیں اور بڑے پاک باز بنتے ہیں۔''

''کیسی پارسائی؟ یہ نظارے ہی تو دعوت نظارہ دیتے ہیں۔ کبھی جسم کے اوپر حصے کی نمائش کرتی ہیں اور کبھی ٹانگوں کی۔ چمکتی، مٹکتی اٹھلاتی اور رجھاتی ہیں۔ ایمان کو متزلزل کرتی ہیں۔ قتل کا سامان کرتی ہیں پھر بسمل کے تڑپنے کا تماشہ دیکھتی ہیں اور الزام ناحق ہم بے گناہوں پر ڈالتی ہیں۔''

''جی چاہتا ہے کہ آپ جیسوں کا وہ حشر کروں کہ پھر کسی لڑکی کے راہ میں آنے کے قابل نہ رہیں۔''

''نہ! نہ!! اتنا غصہ صحت کے لیے ٹھیک نہیں۔''

''آپ بڑے بے شرم اور ڈھیٹ ہیں۔ تھو۔

''ذرہ نوازی کا شکریہ۔''

''ارے کہاں چل دیں؟ رکیے تو۔ ابھی تو کچھ کہا نہیں ابھی تو کچھ سنا نہیں۔''

چلی گئی۔ جیسے بڑی بھولی اور معصوم ہے۔ سامنے والے فلیٹ کی بالکونی میں کھڑی ادائیں دکھاتی ہے اور بڑی پارسا بنتی ہے۔

☆☆☆

NAUSHABA KHATOON

نوشابہ خاتون اردو کے افسانوی ادب میں اب غیر معروف نہیں ہیں۔ فروری ۲۰۰۳ء میں ان کا پہلا افسانہ ''نقار خانہ'' اردو کے موقر رسالہ ''شاعر'' میں شائع ہوا اور اس کے بعد انھوں نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ شاعر کے علاوہ ''آجکل'' ''ایوان اردو'' ''مباحثہ'' ''فنون'' اور ''مژگاں'' میں ان کے متعدد افسانے شائع ہو کر دادو تحسین وصول کر چکے ہیں۔ ان کے افسانوں میں سادگی اور پرکاری کی جو ملی جلی کیفیت ہے وہ انھیں دوسرے ہمعصر افسانہ نگاروں سے ممتاز کرتی ہے۔ زندگی سے جڑی ہوئی سچائیوں کو موصوفہ نے جس فنی چابکدستی کے ساتھ پیش کیا ہے وہ لائق صد تحسین ہے۔ اکثر مقامات پر ان کے قلم کی بیباکی و شوخی' افسانوں کو شرارۂ حیات سے منور کر دیتی ہے۔

امید کہ ان کے اس افسانوی مجموعہ ''نقار خانہ'' کو شرف قبولیت حاصل ہوگی اور قارئین ان کی آئندہ تحریروں کے مشتاق ہوں گے۔

اقبال حسن آزاد

SALIS PUBLICATIONS , MUNGER